ماہنامہ
جہد حق

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
HRCP

جلد نمبر 27......شمارہ نمبر 01......جنوری 2020 (قیمت 10 روپے)
Monthly JUHD-E-HAQ - December-2019 - Registered No. CPL-13

ائیر مارشل (ر) ظفر احمد چوہدری ایک عہد ساز شخصیت۔ (اگست 1926 - دسمبر 2019)

☆انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:	
2-وقوعہ کب ہوا؟	سال / مہینہ / تاریخ
3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں / محلّہ
	ڈاک خانہ / تحصیل وضلع
4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم ورواج سے تعلق ہے	ہاں / نہیں
5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)	
6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل	

7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام	ولد/زوجہ	پیشہ

8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی/سماجی حیثیت	بچہ/بچی	عورت/مرد	غریب/ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کارکن	دیگر (تخصیص کریں)	

9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت/زوجیت	عہدہ	پیشہ
	-1			
	-2			
	-3			

10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد/افراد کی معاشی/سماجی حیثیت	بڑا جاگیردار/زمیندار/بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے/غریب آدمی	بااثر صلاحیت/سیاسی اثر ورسوخ

11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی/ادارہ
	-1			
	-2			
	-3			

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان وغیر جانبدار افراد کے کوائف وموقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق/رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار/پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں

14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ

15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار/اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے/والوں کی رائے

رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں/محلّہ	شہر/ضلع

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: .....

تاریخ:

.....

فہرست

پریس ریلیزیں	03
ایئر مارشل ظفر احمد چوہدری کی یاد میں	05
مفلوج بیوروکریسی	06
اے آر کارنیلیس: اب ایسے منصف کہاں	08
ذہنی بیمار قیدیوں کی جگہ ہسپتال ہے	
موت کی کال کوٹھڑی نہیں	09
سال 2019 میں احمدیوں پر ہونے والے مظالم کی داستان	16
انسانی حقوق کا عالمی دن	17
جبری مزدوری کا نظام اور اس سے جڑے مسائل پر ایک نظر	18

ایچ آر سی پی بانی رکن ایئر مارشل ظفر چودھری کی وفات پر افسوس کا اظہار کرتا ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) اپنے بانیوں میں سے ایک، ایئر مارشل (ریٹائرڈ) ظفر چودھری کی وفات پر گہرے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ ایئر مارشل ظفر چودھری انسانی حقوق کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ انہوں نے 1980 کی دہائی میں، جب پاکستان میں ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا، انسانی حقوق کے ایک آزاد ادارے ایچ آر سی پی کی داغ بیل ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعدازاں، انہوں نے ادارے کی ایگزیکٹیو کونسل کے رکن کے طور پر بھی خدمات سرانجام دیں اور ناساز صحت کے باوجود ایچ آر سی پی کے دفتری فرائض انجام دیتے رہے۔ ایچ آر سی پی لاہور میں سیکریٹریٹ کے قیام میں بھرپور مدد کرنے پر ان کا ہمیشہ ممنون رہے گا۔

ایچ آر سی پی کے پاکستان بھر میں موجود کارکن ان کی کمی کو شدت سے محسوس کریں گے، خاص طور پر ان کے دوست اور ساتھی، چیئرپرسن ڈاکٹر مہدی حسن، اعزازی ترجمان آئی اے رحمان، سابق چیئرپرسن زہرہ یوسف، وائس چیئرپرسن پنجاب سلیمہ ہاشمی اور کونسل رکن حنا جیلانی، جن کے وہ کافی قریب رہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 18 دسمبر 2019]

ایچ آر سی پی کو عدلیہ پر حملے پر تشویش ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کو ریاست کے دو کلیدی اداروں کے درمیان کشیدگی پر شدید فکر ہے اور عدلیہ پر ہونے والے رواں حملے پر تشویش لاحق ہے۔ عدالت کے فیصلے جس نے جنرل مشرف کو غداری کا مرتکب قرار دیا ہے، نے ایک اہم نظیر قائم کی ہے۔ پیراگراف 66 پر اعتراضات، اور نتیجے میں پیدا ہونے والے طوفان پیدا ہونے کے باعث فیصلے کے مرکزی حصے کی قدر کم نہیں ہونی چاہیے۔

ہر قسم کے مقدمے میں سزائے موت کی مخالف کا اعادہ کرتے ہوئے، کمیشن نے تمام ریاستی اداروں کو یاد دلایا ہے کہ انہوں نے آئین سے وفاداری کا عہد کیا ہوا ہے۔ یہ پاکستان کی جمہوریت اور اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے ریاستی فریضے کی اساس ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 20 دسمبر 2019]

ایچ آر سی پی کو جنید حفیظ والے فیصلے پر مایوسی ہوئی ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو توہینِ رسالت کے الزامات پر معلم جنید حفیظ کو ڈسٹرکٹ و سیشن کورٹ ملتان کی طرف سے سنائے جانے والے فیصلے پر مایوسی ہوئی ہے۔

ایچ آر سی پی کے خیال میں مذہب کی تضحیک کے قوانین کا بہت زیادہ غلط استعمال ہوتا ہے۔ نچلی عدالتوں کی سطح پر تاخیری حربوں اور دباؤ کے حامل ٹرائل کے عمل نے اسے اور زیادہ سنگین بنا دیا ہے۔ جرم بذات خود پہلے ہی خودساختہ چوکیداری کی روایت اور سزا سے استثنیٰ کے ساتھ منسلک ہے جس کی نشاندہی 2014 میں محترم حفیظ کے وکیل راشد رحمان کے قتل سے بھی ہوئی تھی۔ نچلی عدالتوں پر نتیجے میں پڑنے والا دباؤ اس وقت بے نقاب ہو جاتا ہے جب ایسے فیصلے عدالتِ عالیہ یا عدالتِ عظمیٰ کی طرف سے کالعدم قرار دے دیے جاتے ہیں۔

پانچ برسوں کے دوران، کم از کم پانچ ججوں نے محترم حفیظ کے مقدمے کو سنا جس نے شفاف ٹرائل کو درحقیقت ناممکن بنا دیا تھا۔ اسی دوران، انہوں نے چھ برس قیدِتنہائی میں بسر کیے ہیں۔ آسیہ بی بی جن پر یہی الزام عائد تھا، آٹھ برس تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد رہا ہوئیں۔ ایسے مقدمات میں انصاف کے تقاضے پورے ہونے میں شدید قسم کی مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔

ایچ آر سی پی کو اعلیٰ عدلیہ پر اعتماد ہے اور امید ہے کہ اپیل میں فیصلہ کالعدم قرار دے دیا جائے گا۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 21 دسمبر 2019]

بطورِ اقلیت نہیں بطورِ شہری مساوی حقوق دیے جائیں

مذہب یا عقیدے کی آزادی پر اپنے رواں کام کے طور پر، پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے قومی بین العقائد ورکنگ گروپ کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں مسیحی، ہندو، احمدی، سکھ، اسماعیلی، شیعہ ہزارہ اور بہائی برادریوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ شرکاء کا مطالبہ تھا کہ عدالت عظمیٰ کے 2014 کے فیصلے (جسٹس جیلانی) کی روح کے عین مطابق مذہبی اقلیتوں کے لیے ایک مؤثر اور آزاد قومی کمیشن قائم کیا جائے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اقلیتوں سے متعلق مردم شماری کے کوائف جلد از جلد جاری کیے جائیں۔

ایچ آر سی پی کے سیکریٹری جنرل حارث خلیق نے کہا کہ سماج کی بنیاد پرستی لمحہ فکریہ ہے۔ شرکاء نے مکران میں ذکری برادری کے ساتھ امتیازی سلوک اور پشاور میں سکھ برادری کے عدم تحفظ سے لے کے گلگت بلتستان میں آبادی میں ردوبدل تک اور اور مذہبی اقلیتوں کے میں بڑھتی ہوئی تقسیم سمیت کئی معاملات پر گفتگو کی گئی۔ احمدیہ برادری کے نمائندوں نے کہا کہ انہیں بطور شہری برابر کے حقوق نہیں دیے گئے اور بطور ''اقلیت'' حقوق کا تو ذکر ہی نہ کریں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سربراہ ڈاکٹر خالد مسعود نے کہا کہ یہ بہت ضروری ہے کہ مذہبی تنوع کا احترام کیا جائے اور مذہبی اقلیتوں کو اسی نظر سے دیکھا جائے جس نظر سے وہ خود اپنے آپ کو دیکھتے ہیں۔

کرسچین اسٹڈی سنٹر کی جنیفیر نے کہا کہ مجوزہ قومی کمشین کو مذہبی اقلیتوں کے معاملے پر نہ صرف ریاست اور اس کے شہریوں کے درمیان بلکہ شہریوں کے اپنے درمیان بھی مکالمے میں بہتری لانے کی کوشش کرنی ہوگی تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں راسخ تعصّبات پر قابو پایا جا سکے۔ سابق سینیٹر افراسیاب خٹک نے کہا کہ صرف جمہوری بندوبست کے ذریعے ہی مذہبی اقلیتوں جیسے غیر محفوظ گروہوں پر بڑھتے ہوئے دباؤ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

جیلانی فیصلے کے نفاذ میں رکاوٹوں کا ذکر کرتے ہوئے، سابق سینیٹر فرحت اللہ بابر نے کہا کہ آئین کے آرٹیکل 146 کے تحت، حکومت مذہبی اقلیتوں کے معاملات پر قانون سازی کر سکتی ہے چاہے یہ معاملات صوبوں کو ہی منتقل کیوں نہ ہو گئے ہوں۔ انسانی حقوق کے حوالے سے پاکستان کے عالمی فریضے بھی حکومت کو ایسا کرنے کا پابند بناتے ہیں۔

نامور صحافی غازی صلاح الدین نے کانفرنس کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کیا کہ کہ مذہبی اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے آزاد ذرائع ابلاغ کا ہونا ضروری ہے۔

پریس ریلیز۔ لاہور۔ 13 دسمبر 2019]

نیا سال مبارک

تم کام ہو، اور کام کا مطلب ہے تھکن بس
آرام نہیں، شام کا مطلب ہے تھکن بس
بے کیف تھا دن، رات ستاروں سے تہی ہے
سنتے ہو؟ تمہارے لیے اک نظم کہی ہے
ہاتھوں پہ مشقت کا تبرک ہے؟ تمہیں بھی!
ماتھوں پہ ورکشاپ کی کالک ہے؟ تمہیں بھی!
شک ہو تمہیں اس بارے میں یا پک ہے، تمہیں بھی
اک آس میں بیدار ابھی تک ہو، تمہیں بھی
آنکھوں پہ روا خواب کی دستک ہو تمہیں بھی
اے دوست! نیا سال مبارک ہو تمہیں بھی

(ادریس بابر)

ائیر مارشل ظفر احمد چوہدری کی یاد میں

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے کونسل اراکین اور عملے نے 30 دسمبر 2019 کو ائیر مارشل (ریٹائرڈ) ظفر چوہدری کے لیے ایک تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا۔ چوہدری 3 مارچ 1972 سے 15 اپریل 1974 تک پاکستان فضائیہ کے آٹھویں سربراہ کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ وہ ایچ آر سی پی کے بانی اراکین میں سے بھی تھے۔

ایچ آر سی پی کے اعزازی ترجمان آئی اے رحمان نے کہا کہ ائیر مارشل ایک بہترین لکھاری تھے اور انہیں مطالعے کا بھی بہت شوق تھا۔ کم گو چوہدری فارسی زبان میں رواں تھے اور اپنی گفتگو میں اپنے پسندیدہ اشعار کا استعمال کرتے تھے۔ مسٹر رحمان کا کہنا تھا کہ ائیر مارشل مذہبیت پرستی سے آزاد تھے۔ بلکہ انہوں نے مذہب کے نام پر ہونے والی کسی بھی سیاسی پیش رفت یا تقریر کی مخالفت کی۔ احمدیہ برادری کے رکن ہونے کے باوجود کبھی انہوں نے اقلیتوں کے حقوق سے متعلق سرگرمیاں خود سے شروع نہیں کیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی یہ توقع کی کہ ایک احمدی ہونے کی حیثیت سے اُن سے مشورہ کیا جائے۔

ایچ آر سی پی کی کونسل رکن حنا جیلانی نے کہا کہ ائیر مارشل اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایچ آر سی پی کا رکن بننا چاہا تھا: یہ بات اُن کے کردار کی عظمت کی غماز ہے کیونکہ وہ پاکستان میں انسانی حقوق کے معاملات سے نبٹنے کے لیے راستے تلاش کرنے میں بہت زیادہ سرگرم تھے۔ ائیر مارشل 1987 میں سندھ میں ایچ آر سی پی کے فیکٹ فائنڈنگ مشن کا بھی حصہ تھے اور محترمہ جیلانی نے یاد کرتے ہوئے کہا کہ کس طرح وہ پاکستان فضائیہ میں اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے کرفیو کے دوران حیدرآباد تک رسائی پانے میں کامیاب ہوئے۔ اگرچہ ائیر مارشل کا ذہن سیاسی نہیں تھا مگر ان کا عزم اور اصول اتنے مضبوط تھے کہ انہیں کسی بھی قسم کے حالات میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا بہت اچھی طرح ادراک ہو جاتا تھا۔ محترمہ جیلانی نے کہا کہ ائیر مارشل اپنے ساتھیوں میں تحمل کا نمونہ بھی تھے: انہوں نے کبھی بھی اپنے ذاتی خیالات کو حقائق کی عظمت پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں ہمیشہ یقین رہا کہ ہر وہ فیکٹ فائنڈنگ مشن جس میں ائیر (ریٹائرڈ) مارشل شریک ہوئے ہوں ایک منفرد رپورٹ پیدا کرے گا۔

ایچ آر سی پی کے رکن حسین نقی کے خیال میں ائیر مارشل بڑے دانشمند اور نظم وضبط کے حامل انسان تھے جنہوں نے ہر قسم کی ناانصافی، اور بدعنوانی کے خلاف بڑا پکا مؤقف اپنایا ہوا تھا۔ اُن کی ہر سرگرمی پر نظر تھی اور جب سرگرمیاں مخصوص بجٹ کے اندر پوری ہو جاتیں تو اُن کے لیے یہ بات بڑی مسرت کا سبب بنتی۔ ہر ایک نے اجلاسوں میں ائیر مارشل (ریٹائرڈ) کی پابندیِ وقت کا ذکر کیا۔ ایچ آر سی پی کے کونسل رکن راجہ اشرف کا کہنا تھا وہ وہ ہر اجلاس کے موقع پر کمیٹی روم کی ایک ہی نشست پر براجمان ہوتے تھے۔ کونسل رکن سلیمہ ہاشمی نے یاد کرتے ہوئے کہا کہ وہ اور ائیر مارشل اکثر سیالکوٹ کے متعلق، جیسے کہ فیض احمد فیض کے بارے میں گفتگو کرتے تھے، ائیر مارشل بھی وہیں پیدا ہوئے تھے۔ ائیر مارشل نے اپنے اعمال اور الفاظ سے ثابت کیا کہ ان کے اصولوں اور وقار جیسے مرد اور عورتیں افسانوی شخصیات نہیں ہوتیں۔ ایچ آر سی پی پاکستان میں انسانی حقوق کی تحریک کے لیے ان کی خدمات کے لیے ان کا مقروض ہے۔

آرمی پبلک اسکول پر حملے کی یاد میں تقریب

دادو آرمی پبلک اسکول پشاور پر دہشت گردوں کے حملے میں شہید ہونے والے ڈیڑھ سو سے زائد بچوں اور اساتذہ کی یاد میں 16 دسمبر 2019 کو گھوٹھ سدھار سنگت نے ایچ آر سی پی کے ضلعی کارکنان کے تعاون سے ایک تقریب کا اہتمام کیا جس سے خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ ہر برس 16 دسمبر کو ان کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے مضبوط قومی اتحاد کی ضرورت ہے۔

انہوں نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ ملک پر متعصب سوچ اور انتہا پسندانہ ذہنیت کو مسلط نہیں ہونے دیں گے۔ مقررین میں غلام مصطفیٰ عباسی، گلزار احمد، حاکمزادی، امداد بگھیو اور دیگر شامل تھے۔

(غلام مصطفیٰ)

ہندو و احمدی برادری کے کچھ خاندانوں کی نقل مکانی

جیکب آباد جیکب آباد میں بڑھتی ہوئی بدامنی اور لاقانونیت سمیت پولیس اہلکاروں کی زیادتیوں سے تنگ آ کر ہندو برادری سے تعلق رکھنے والے کئی خاندان جیکب آباد سے ہندوستان منتقل ہو گئے ہیں۔ سال 2018 اور 2019 کے دوران بھی درجنوں ہندو خاندان اپنے بیوی بچوں سمیت جیکب آباد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ہجرت کرنے والے ہندوؤں کے مطابق وہ یہاں خود کو محفوظ تصور نہیں کر رہے تھے۔ وہ ہر وقت خوف اور ڈر کے سائے میں سانس لے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ضلعی انتظامیہ اور پولیس کا رویہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔ کچھ عناصر ان سے بھتہ وصول کرتے تھے اور ان کی کہیں بھی دادرسی نہیں ہوتی تھی۔ انہیں اپنے بچوں اور مال واسباب کے تحفظ کی خاطر پاکستان چھوڑنا پڑا۔ اسی طرح، دھمکیوں، خوف اور حملوں سے تنگ آ کر احمدی برادری کے چھ خاندان بھی جیکب آباد چھوڑ کر ربوہ (چناب نگر) منتقل ہو گئے ہیں۔

(حفیظ جتوئی)

مفلوج بیوروکریسی

آئی۔اے۔رحمان

ہمارے ہاں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ بیوروکریسی مختلف احتسابی عوامل کے ڈر کی وجہ سے اپنے فرائض انجام دینے میں ہچکچاتی ہے، اور اس تاثر کی تصدیق ایک مستند تحقیق نے کی ہے، جس میں انتظامیہ میں جلد سے جلد تبدیلیاں لانے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ ''جوابدہی کے مختلف طرائق کار میں افسرشاہی کی فیصلہ سازی'' کے عنوان کے ساتھ اس تحقیق کو شاہد رحیم شیخ اور سیف اللہ خالد نامی سینئر انتظام کاروں نے لاہور کے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پبلک پالیسی آف نیشنل اسکول آف پبلک پالیسی کے لیے انجام دی ہے اور اسے این آئی پی پی کے پالیسی پیپر کے طور پر جاری کیا گیا ہے۔

یہ تحقیق 17ویں سے 22ویں گریڈ میں شامل 721 سول سرونٹس میں سے 610 افسران کے جوابات پر مبنی ہے۔

حیران کن طور پر وفاقی حکومت کے عہدوں پر فائز 5 لاکھ 81 ہزار 240 سول سرونٹس میں سے 95.02 فیصد گریڈ ایک سے 16 میں شامل ہیں، جبکہ صرف 4.98 فیصد سول سرونٹس 17 سے 22ویں گریڈ میں ہیں، جو اہم فیصلہ سازی کی سطح کے عہدوں پر فائز ہیں۔

پھر تحقیق میں شامل ان 17 سے 22ویں گریڈ کے افسران میں بھی مزید تقسیم موجود ہے۔ جیسے 49.1 فیصد افسران 17 اور 18 گریڈ سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ 49.3 فیصد 19 اور 20 گریڈ میں موجود ہیں۔ ان میں سے 13.5 فیصد 3 سے 5 سالہ سروس کا تجربہ رکھتے ہیں جبکہ 21.9 فیصد 13 سے 17 سال سے سروس میں ہیں اور سب سے زیادہ (61.5 فیصد) وہ سول سرونٹس شامل ہیں جن کی ملازمت کو 17 برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔

تحقیقی جائزے میں شامل افراد سے پوچھا گیا کہ وہ بیوروکریسی میں فرائض کی انجام دہی میں موجودہ ہچکچاہٹ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور اس ہچکچاہٹ کی وجہ سے بننے والے 4 عناصر کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ سول سرونٹس کے جوابات گہری سنجیدگی کے متقاضی ہیں۔

اگرچہ سول سرونٹس کی اکثریت کا ماننا ہے کہ وہ محنتی ہیں اور پیچیدہ مسائل حل کرنا بھی جانتے ہیں، تاہم کام میں ان کی ہچکچاہٹ کے بارے میں عوامی رائے یہ پائی جاتی ہے کہ

- ☆ بیوروکریسی فیصلے نہیں لے رہی ہے،
- ☆ بیوروکریسی ذمہ داری سے کترا رہی ہے
- ☆ عوام کو بیوروکریسی تک رسائی حاصل نہیں ہے،

> جائزے میں شامل سول سرونٹس کی ایک بڑی تعداد (70 فیصد) یہ دعویٰ کرتی ہے کہ انہیں سول سرونٹس کنڈکٹ رُولز (1964) سے آگاہی ہے اور 55 فیصد سول سرونٹس کے مطابق ان اصولوں کو کسی بھی قسم کی بدعنوانی روکنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ تاہم جائزے میں شامل 42 فیصد سول سرونٹس سمجھتے ہیں ان اصولوں کو شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے اور 37 فیصد کے نزدیک یہ اصول بیوروکریسی کے ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی سے باز رکھنے میں مددگار ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔

- ☆ بیوروکریسی میں مسئلے کو حل کرنے کا رجحان نہیں پایا جاتا اور
- ☆ بیوروکریسی عوامی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتی ہے۔

جہاں تک نیب کے کردار کا تعلق ہے تو سول سرونٹس کی اکثریت اس بات سے متفق ہے کہ

- ☆ نیب بیرونی اثر و رسوخ سے آزاد نہیں ہے،
- ☆ نیب افسران میں ٹھوس پیشہ ورانہ تجربے یا تکنیکی اہلیت کی کمی پائی جاتی ہے،
- ☆ مختلف احتسابی اداروں کے درمیان واضح طور پر متعین حدود دکھائی نہیں دیتیں،
- ☆ حکومت جن سول سرونٹس کو سیاسی مخالفین کے قریب تصور کرتی ہے ان کے خلاف نیب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے،
- ☆ سول سرونٹس کے لیے عام طور پر کافی توہین اور ذلت آمیز احتسابی عمل پایا جاتا ہے اور
- ☆ نیب سول سرونٹس کے خلاف میڈیا میں خبریں لیک کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔

سول سرونٹس سے جب عدلیہ کے کردار اور مفاد عامہ سے متعلق تاثرات کے بارے میں پوچھا گیا تو اکثر کا کہنا تھا کہ

- ☆ عدالتی نظرثانی کا مقصد مفاد عامہ کو تحفظ فراہم کرنا ہے،
- ☆ انتظامی معاملات میں عدلیہ کی دخل اندازی معقول عمل نہیں ہے،
- ☆ کثرت سے سوموٹو ایکشن کا استعمال انتظامی فیصلہ سازی کے عمل کو بہتر نہیں بناتا،
- ☆ سرکاری ملازمین عدالتی احتساب کے ڈر سے فیصلوں میں تاخیر کر رہے ہیں اور
- ☆ پیشیوں کے دوران اعلیٰ عدلیہ بیوروکریسی کی تذلیل کرتی ہے۔

جب میڈیا کے کردار پر روشنی ڈالنے کو کہا گیا تو زیادہ تر سول سرونٹس نے کہا کہ

- ☆ مرکزی میڈیا انتظامی فیصلوں کو درست طریقے سے رپورٹ نہیں کرتا،
- ☆ میڈیا سنسنی خیزی سے اجتناب نہیں کرتا، اور
- ☆ عام طور پر خیال یہی ہے کہ میڈیا رپورٹرز انتظامی عوامل کے بارے میں مناسب علم ہی نہیں رکھتے۔

جب ان سے سیاسی اثر و رسوخ کے بارے میں پوچھا گیا تو ان میں سے اکثریت کی رائے کچھ یوں تھی کہ

- ☆ سیاستدانوں اور سول سرونٹس کا گٹھ جوڑ وجود رکھتا ہے،
- ☆ اس گٹھ جوڑ کی وجہ سے ترقیاتی کام تعطل کا شکار ہوتے ہیں، اور
- ☆ اس گٹھ جوڑ کی وجہ سے مالی کرپشن کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

سول سرونٹس سے اس تحقیق میں داخلی ضابطوں اور نظم و ضبط کے طریقہ کار یعنی سول سرونٹس کنڈکٹ رُولز (1964) اور استعداد اور انضباطی قواعد (1973) اور کے بارے میں بھی ان کی رائے لی گئی۔

جائزے میں شامل سول سرونٹس کی ایک بڑی تعداد (70 فیصد) یہ دعویٰ کرتی ہے کہ انہیں سول سرونٹس کنڈکٹ رُولز (1964) سے آگاہی ہے اور 55 فیصد سول سرونٹس کے مطابق ان اصولوں کو کسی بھی قسم کی بدعنوانی روکنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ تاہم جائزے میں شامل 42 فیصد سول سرونٹس سمجھتے ہیں ان اصولوں کو شاذ و نادر ہی استعمال کیا جاتا ہے اور 37 فیصد کے نزدیک یہ اصول بیوروکریسی کے ضابطہ

اخلاق کی خلاف ورزی سے باز رکھنے میں مددگار ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔

82 فیصد سول سرونٹس نے بتایا کہ وہ استعداد اور انضباطی قواعد (1973) کی آگاہی رکھتے ہیں، قریب 63 فیصد سول سرونٹس کے نزدیک ان اصولوں کو کسی بھی قسم کی بدعنوانی روکنے کے لیے وضع کیا گیا ہے تاہم محض 44 فیصد ہی اسے کرپشن کی روک تھام میں مددگار قرار دیتے ہیں۔

حل کیا ہے؟

تحقیق میں بیوروکریسی کی صورتحال بہتر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز دی گئی ہیں۔

- ☆ فیصلہ سازی سے متعلق چیلنجز کو تسلیم کیا جائے۔
- ☆ بیوروکریسی کی قیادت اور نیب کے درمیان حریفانہ کشمکش کے تاثر کو ختم کرنے کے لیے دونوں کے درمیان پائیدار اور باہمی احترام کے حامل مذاکرات کی ضرورت ہے۔
- ☆ عدالتی نگرانی لازمی ہے لیکن سول سرونٹس کی ذاتی حیثیت میں تذلیل نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اس سے فیصلہ سازی کا ماحول بہتر بنانے میں کوئی مدد حاصل ہوتی ہے۔
- ☆ ماتحت افسران کی میڈیا میں غلط عکاسی کو روکنے کے لیے بیوروکریسی کی قیادت کے پاس باضابطہ رہنما اصول دستیاب ہونے چاہئیں۔
- ☆ بیوروکریسی میں موجود فیصلہ سازوں کو سیاسی 'بڑوں' کے ناجائز اثر و رسوخ سے محفوظ رکھنے کے لیے کوششیں جاری رکھی جانی چاہئیں۔
- ☆ فیصلہ سازی کے عمل میں تعطل کی وجوہات کا پتہ لگانے کے لیے مزید اقدامات کیے جائیں۔
- ☆ ان نکات میں ایک یہ نکتہ بھی شامل کیا جاسکتا ہے کہ داخلی ضابطہ اخلاق اور نظم وضبط کے طریقہ کار کو سختی کے ساتھ نافذ کیے جانے کی ضرورت ہے۔
- ☆ سول سرونٹس کو لاحق خوف کے پیچھے دیگر محرکات جیسے احد چیمہ اور فواد حسن کی گرفتاری، بریگیڈیئر اسد منیر کی خودکشی اور سول سرونٹس کے خلاف متعدد کیسز شامل ہوسکتے ہیں جن کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ سیکریٹری یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ چونکہ (نیب اور ایف آئی اے کی جانب سے) متعدد افسران کو ہراساں کیا جارہا ہے اس لیے بیوروکریسی موجودہ احتسابی مہم کے باعث خوف کا شکار ہے۔ (نیب چیئرمین نے اس تاثر کو غلط قرار دیا)، لیکن ایوب، یحییٰ، بھٹو اور ضیاالحق حکومتوں کی جانب سے بیوروکریسی کو پاک صاف کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں تھیں، انہیں بیوروکریسی اب تک بھولی نہیں ہے۔

چونکہ اس تحقیق میں اچھا لٹریچر ریویو اور فیصلہ سازی کے عمل پر سودمند مباحثہ شامل ہے اس لیے سول سرونٹس، پبلک ایڈمنسٹریشن کے طلبا اور تبصرہ نگار اس تحقیق سے معقول فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس پالیسی مقالے میں ہچکچاہٹ کے پیچھے چھپی ایک اہم وجہ کا تذکرہ نہیں ملتا، وہ ہے گرتے ہوئے تعلیمی معیارات اور فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی رپورٹس کو اہمیت نہ دینے کی وجہ سے سول سروسز کو دستیاب ٹیلنٹ کے معیار میں گراوٹ۔ شاید اب سول بیوروکریسی کی رِٹ کی کمزوری کے حوالے سے سروے کروانے کی بھی ضرورت ہے۔

داخلی عناصر کی گنجائش نکالنے کے باوجود بھی یہ تحقیق بیوروکریسی کے خوف کو ختم کرنے کے لیے ایک مضبوط کیس پیش کرتی ہے کیونکہ انتظامی جمود قلیل عرصے کے اندر ہی پورا نظام دھرم برم کردیتا ہے۔ (بشکریہ ڈان)

82 فیصد سول سرونٹس نے بتایا کہ وہ استعداد اور انضباطی قواعد (1973) کی آگاہی رکھتے ہیں، قریب 63 فیصد سول سرونٹس کے نزدیک ان اصولوں کو کسی بھی قسم کی بدعنوانی روکنے کے لیے وضع کیا گیا ہے تاہم محض 44 فیصد ہی اسے کرپشن کی روک تھام میں مددگار قرار دیتے ہیں۔

سول سرونٹس کو لاحق خوف کے پیچھے دیگر محرکات جیسے احد چیمہ اور فواد حسن کی گرفتاری، بریگیڈیئر اسد منیر کی خودکشی اور سول سرونٹس کے خلاف متعدد کیسز شامل ہوسکتے ہیں جن کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ سیکریٹری یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ چونکہ (نیب اور ایف آئی اے کی جانب سے) متعدد افسران کو ہراساں کیا جارہا ہے اس لیے بیوروکریسی موجودہ احتسابی مہم کے باعث خوف کا شکار ہے۔ (نیب چیئرمین نے اس تاثر کو غلط قرار دیا)، لیکن ایوب، یحییٰ، بھٹو اور ضیاالحق حکومتوں کی جانب سے بیوروکریسی کو پاک صاف کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں تھیں، انہیں بیوروکریسی اب تک بھولی نہیں ہے۔

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کرسکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جاسکے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر موجود ہیں

www.hrcp-web.org

اے آر کارنیلیس: اب ایسے منصف کہاں

زاہدہ حنا

اُن دنوں کئی حوالوں سے مجھے پاکستان کے چوتھے چیف جسٹس جناب جسٹس ایلون رابرٹ کارنیلیس کی یاد بار بار آتی ہے۔ ہندوستان کے شہر آگرہ میں 8 مئی 1903 کو پیدا ہونے والا غیر معمولی ذہانت اور علم کا حامل یہ قانون دان اور فلسفی 21 دسمبر 1991 کو 88 برس کی عمر میں لاہور میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔

کارنیلیس نے الہ آباد اور کیمبرج یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا اور اپنے کیریئر کا آغاز اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر کیا۔ بعد ازاں انھوں نے عدالتی کیریئر اختیار کرلیا اور اپنی منفرد ذہانت اور محنت سے بڑی شہرت اور نام کمایا، کئی کتابیں تصنیف کیں اور تحریک پاکستان میں سرگرم کارکن کی حیثیت سے جدوجہد بھی کی۔

تقسیم سے قبل 1946 میں انھیں لاہور ہائی کورٹ کا ایسوسی ایٹ جج مقرر کیا گیا لیکن پاکستان کی تشکیل کے بعد انھوں نے اپنے آبائی وطن میں رہنے کے بجائے اس ملک کی جانب کوچ کرنے کا فیصلہ کیا جس کے قیام کے لیے انھوں نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب نوتخلیق ملک پاکستان کو ہر شعبہ زندگی میں تعلیم یافتہ افراد اور ماہرین کی شدید ضرورت تھی۔

وہ مسلمان نہیں تھے لیکن مسلمانوں کے لیے حاصل کیے جانے والے ملک کی خدمت کے لیے انھوں نے رضا کارانہ نقل مکانی کی۔ ذرا اندازہ کریں کہ ہندوستان کتنی فرقہ وارانہ کشیدگی کے ماحول میں تقسیم ہوا تھا۔ تقسیم کے بعد ہونے والی خوں ریز نقل مکانی کے دوران ہندو، مسلم اور سکھوں نے ایک دوسرے کا کس قدر بہیمانہ قتل عام کیا تھا۔

تاہم، یہ اس دور کی قیادت بالخصوص جناح صاحب کا کمال تھا کہ انھوں نے اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے ملک میں مذہبی رواداری کی عملی مثالیں قائم کیں۔ انھوں نے جوگندر ناتھ منڈل کو پاکستان کا پہلا وزیر قانون مقرر کیا۔ اے۔ آر۔ کارنیلیس نے پاکستان کا انتخاب کیا تھا، یہاں آنے کے بعد انھیں وزیر قانون کا سیکریٹری قانون بنا دیا گیا۔ آج ہم کو پاکستان میں جو اعلیٰ عدالتی اور زیریں عدالتی نظام نظر آتا ہے۔

اس کو قائم کرنے میں جسٹس کارنیلیس نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل نے ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان کے بہترین مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ملک میں ایک موثر قانونی و عدالتی نظام قائم کیا۔

جسٹس اے آر کارنیلیس کو 1960 میں پاکستان کا چیف جسٹس مقرر کیا گیا۔ اب تک اس معزز عہدے پر جتنے بھی لوگوں نے فرائض سرانجام دیے ہیں ان میں جن چند لوگوں کو غیر معمولی عزت اور احترام حاصل ہوا ہے ان میں جسٹس کارنیلیس کا نام بھی شامل ہے۔ انھوں نے پاکستان کو صحیح معنوں میں مذہبی امتیاز اور انتہا پسندی سے پاک ریاست بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

انھیں اندازہ تھا کہ مذہبی انتہا پسندی نو آزاد ملک کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ثابت ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ان کا زیادہ زور اس بات پر تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور ریاست کے تمام شہریوں کو اپنے عقائد پر عمل کرنے کی مکمل آزادی فراہم کی جائے۔ یہ تمام کام وہ انسان کر رہا تھا جس کا تعلق ان مسلم اکثریتی صوبوں سے نہیں تھا جہاں پاکستان بنا تھا۔ وہ مسلمان نہیں عیسائی تھے اور اینگلو انڈین خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی غریب خاندان کا ایک ایسا تعلیم یافتہ نوجوان تھا جو اپنے شاندار مستقبل کی تلاش میں پاکستان آ گیا تھا۔ ان کے والدین رومن کیتھولک برادری میں بہت معزز مقام رکھتے تھے۔ ان کے والد میتھ میٹکس کے پروفیسر تھے۔ ان کی خاندانی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کیمبرج جیسی یونیورسٹی میں بھیجا گیا تھا۔

وہ ہندوستان کی سول سروس کا حصہ تھے۔ اپنی قابلیت اور خاندانی اثر و رسوخ کی بنیاد پر وہ ہندوستان میں بھی اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتے تھے لیکن وہ ایک فلسفی اور خواب دیکھنے والے انسان تھے لہٰذا انھوں نے انسانی وسائل سے محروم ایک نو آزاد ملک، پاکستان جانے اور اس کے قانونی نظام کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے مشکل کام کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور اس میں سرخرو ہوئے۔

جسٹس اے آر کارنیلیس ایک سیکولر قانون دان اور دانشور تھے۔ برصغیر کی تاریخ کا یہ وہ سنہرا دور تھا جب دانشوروں پر مذہبی، مسلکی، نسلی یا لسانی تنگ نظری کا غلبہ نہیں تھا۔ رواداری، برداشت اور تحمل سے ایک دوسرے کا نقطہ نظر سننا اور مخالف کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا۔

یہ ہمارے ملک کا ایک بڑا المیہ تھا کہ ہماری عدلیہ، مقننہ، انتظامیہ فوجی و تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے سیکولر فکر کے حامل لوگوں نے چھوٹے چھوٹے مفاد کی خاطر اپنے اصولوں کو ترک کر کے تنگ نظری اختیار کر لی، جس کی وجہ سے ملک میں قانون کی بلا امتیاز حکمرانی قائم نہ ہوسکی اور آمریت نے مضبوطی سے اپنے پنجے گاڑ لیے۔ اس حوالے سے جسٹس منیر کی مثال ہی کافی ہوگی۔

وہ ایک آزاد فکر رکھنے والے کھلے ذہن کے جج تھے۔ ان کی مرتب کردہ منیر رپورٹ اعلیٰ سیکولر اقدار کی شاندار عکاسی کرتی ہے لیکن اسے ایک المیہ کے سوا اور کیا کہا جائے کہ انھوں نے ''نظریہ ضرورت'' ایجاد کیا اور اس کے تحت گورنر جنرل غلام محمد سے دستور ساز اسمبلی کی تحلیل کو جائز اقدام قرار دیا۔

اس وقت کی فیڈرل کورٹ (سپریم کورٹ) جب اس غیر قانونی اور غیر آئینی اقدام کو جائز قرار دے رہی تھی تو جسٹس اے۔ آر کارنیلیس وہ واحد جج تھے جنھوں نے جسٹس منیر کے اس فیصلے سے اختلاف کیا تھا۔ جسٹس منیر کے اس فیصلے کے بعد ہر آنے والے مہم جو آمر کے لیے راستہ ہموار ہوگیا اور اعلیٰ عدلیہ نے پے در پے ان کے حق میں فیصلے دینے شروع کر دیے۔

کیا اس کو محض حسن اتفاق کہا جائے گا کہ مولوی تمیز الدین مقدمے میں جس سندھ ہائی کورٹ نے غلام محمد کے اقدام کو کالعدم قرار دیا تھا اس کے سربراہ جسٹس جارج کانسٹینٹائن تھے۔ ہائی کورٹ کے فیصلے کو مسترد کرنے والی فیڈرل کورٹ میں جس واحد جج نے فیصلے سے اختلاف کیا تھا وہ اے۔ آر۔ کارنیلیس تھے۔ مسلم ملک کی اعلیٰ عدلیہ کے دو غیر مسلم ججوں نے عدل، انصاف اور قانون کی حکمرانی کا پرچم بلند رکھا اور جذبہ ایمانی سے سرشار ججوں نے آمرانہ طاقتوں کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔

جن ملکوں کی اعلیٰ عدلیہ نے آزادی کے حصول اور جمہوری عمل کے آغاز کے فوراً بعد سے آئین و قانون کی بالادستی کے لیے تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنا تاریخی کردار ادا کیا وہ ملک دنیا کے مضبوط جمہوری ملک بن چکے ہیں۔ اس حوالے سے امریکا کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

آج سے تقریباً 225 سال قبل اس کی سپریم کورٹ کے پہلے چیف جسٹس جون جے نے جنھیں صدر جارج واشنگٹن نے اس عہدے پر فائز کیا تھا، اپنا منصب سنبھالتے ہی یہ مثال قائم کر دی تھی کہ سپریم کورٹ قانون سازی کے بارے میں رائے نہیں دے گی یعنی وہ قانون سازی کے عمل میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ وہ صرف ان معاملات کی آئینی حیثیت کا جائزہ لے گی جو اس کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ اسی طرح امریکی سپریم کورٹ میں سب سے زیادہ مدت تک چیف جسٹس رہنے کا اعزاز رکھنے والے جج جون مارشل نے 218 سال پہلے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا تھا۔

انھیں امریکا کی سپریم کورٹ کا سب سے بااثر جج تصور کیا جاتا ہے جنھوں نے سپریم کورٹ کو حکومت سے آزاد طاقتور ادارے کے طور پر منظم کیا جو ریاست کا تیسرا مضبوط ستون بن گیا۔ انھوں نے ملک میں آئین اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے مثالی فیصلے کیے۔ امریکا میں ایسا اس لیے ہوسکا کہ حکومتوں نے عدلیہ کو غلام بنانے پر اصرار نہیں کیا اور اس ملک کی اعلیٰ عدلیہ کے جج بھی انصاف کے اصولوں کے لیے ڈٹ کر کھڑے ہوگئے۔ ہمارے یہاں یہ نہیں ہوسکا۔ حکمرانوں نے ابتدا سے ہی عدلیہ کو اپنے تابع کر لیا اور جج ان کی مزاحمت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

کاش ہمارے ملک کا ہر ادارہ یہ طے کر لے کہ خواہ کچھ بھی ہو آئین اور قانون سے انحراف کی راہ اختیار نہیں کی جائے گی تاکہ جسٹس اے آر کارنیلیس کا اپنے آبائی وطن میں بہترین مستقبل کو چھوڑ کر پاکستان آنے اور یہاں کسی شاندار گھر یا کوٹھی کے بجائے 40 سال تک لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے ایک کمرے میں زندگی گزارنے کا فیصلہ غلط ثابت نہ ہو۔

(بشکریہ ایکسپریس نیوز)

ذہنی بیمار قیدیوں کی جگہ ہسپتال ہے موت کی کال کوٹھڑی نہیں

پاکستان کی جیلوں میں جن لوگوں کے سر پر پھانسی کا پھندہ لٹک رہا ہے ان میں سے کئی ایسے افراد ہیں جو مختلف قسم کی شدید ذہنی بیماریوں کا شکار ہیں۔ ملک کے سرکاری طبی بورڈز ان کی ذہنی بیماری کی تصدیق کر چکے ہیں مگر اس کے باجود وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پڑے ہیں اور کچھ جیل کے ہسپتالوں میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ ملکی و عالمی قوانین کے رو سے ایسے لوگوں کو صحت کے مراکز میں ہونا چاہیے اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے علاج معالجے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کرے۔ مگر اس کے باوجود ملکی و عالمی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کے حکام انہیں رہا کر کے ان کی صحت یابی کے لیے کسی قسم کی کاوش کرنے سے انکاری ہے۔

جسٹس پراجیکٹ پاکستان (جے پی پی) نامی تنظیم، جو سزائے موت کے قیدیوں کے حقوق کے لیے کام کر رہی ہے، نے اس حوالے سے ایک تحقیقی رپورٹ شائع کی ہے جس کے کچھ حصوں کا ترجمہ آپ کے مطالعے کے لیے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔

کنیزہ بی بی

موت کی کال کوٹھڑی میں بیتے برس: 28

ذہنی بیماری: شیزوفرینیا

قیدخانہ: پاکستان انسٹیٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ

موجودہ حالت: کنیزہ کا مقدمہ عدالتِ عظمیٰ کے ایک بڑے بنچ کے سامنے زیرِ غور ہے

مقدمے کا تاریخ وار احوال

1989

28 جولائی: کنیزہ کو چھ افراد کے قتل میں دفعہ 302/324 کے تحت نامزد کیا گیا

1991

7 جنوری: ٹرائل کورٹ نے کنیزہ بی بی اور خان محمد کو سزائے موت سنائی

1994

یکم مارچ: لاہور ہائی کورٹ نے اپیل مسترد کی

2000

19 فروری: رحم کی پٹیشن خارج ہوئی

یکم اپریل: بلیک وارنٹ جاری ہوئے؛ پھانسی کی تاریخ 19 اپریل طے پائی

18 اپریل: صدر نے ایک حکم کے ذریعے اس کی پھانسی پر عملدرآمد روک دیا

9 مئی: پتہ چلا کہ کنیزہ کو شیزوفرینیا کا مرض لاحق ہے۔ اسے لاہور میں ذہنی امراض کے ہسپتال منتقل کیا گیا۔

2006

21 جنوری: کنیزہ کو عارضی طور پر پنجاب انسٹیٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ (پی آئی ایم ایچ) منتقل کیا گیا

2015

18 مارچ: میڈیکل بورڈ نے کہا کہ کنیزہ کو شیزوفرینیا لاحق ہے اور اسے علاج کی ضرورت ہے

2018

21 اپریل: ایس سی نے کنیزہ کے مقدمے کا ازخود نوٹس لیا؛ میڈیکل بورڈ قائم کرنے اور کنیزہ بی بی کو پی آئی ایم ایچ منتقل کرنے کا حکم دیا

23 اکتوبر: عدالتِ عظمیٰ نے کنیزہ بی بی کے تازہ طبی معائنے اور اسے پی آئی ایم ایچ منتقل کرنے کا حکم دیا

کنیزہ بی بی شدید نوعیت کے شیزوفرینیا کا شکار ہے اور لگ بھگ 30 برسوں سے جیل میں ہے۔ اسے 1989 میں گرفتار کیا گیا جب وہ کم عمر تھی اور چھ افراد کے قتل میں شریک مجرم ہونے پر 2001 میں سزائے موت سنائی گئی۔ اس کا شروع دن سے مؤقف ہے کہ وہ بے قصور ہے۔

اسے 2006 میں لاہور سنٹرل جیل (کوٹ لکھپت) س پنجاب انسٹیٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ (پی آئی ایم ایچ) منتقل کیا گیا، اور پھر 2018 میں دوبارہ وہاں منتقل کیا گیا جہاں اس کا علاج جاری ہے

قید کے دوران، اس کی ذہنی حالت اس حد تک بگڑی ہے کہ گذشتہ آٹھ برسوں سے اس نے ایک لفظ تک نہیں بولا۔

''اگر کوئی فرد ذہنی بیمار ہے تو آپ اسے کیسے لٹکا سکتے ہیں''

سابق چیف جسٹس ثاقب نثار

ذہنی بیمار قیدیوں کنیزہ بی بی اور امداد علی کے مقدمے کی سماعت کے دوران

پس منظر

کنیزہ بی بی نہایت غریب گھرانے میں پیدا ہوئی اور گزر بسر کرنے کے لیے ایک گھر میں ملازمہ کے طور پر کام کرتی تھی۔ 1989 میں اس کے مالک کی بیوی اور بچے قتل ہو گئے جس پر کنیزہ اور اس کے مالک کو بعد ازاں گرفتار کیا گیا اور مجرم قرار دیا گیا۔ کنیزہ کے خاندان کے مطابق، اصل مجرم جن کا کنیزہ کے مالک کے ساتھ طویل عرصے سے زمین کا تنازعہ چلا آ رہا تھا، گرفتار ہوئے تھے مگر پولیس نے رشوت لے کر انہیں چھوڑ دیا تھا۔ تب انہوں نے کنیزہ پر الزام لگا کر ایک جھوٹی پولیس رپورٹ درائر کی۔

کنیزہ ہمیشہ سے خود کو بے قصور کہہ رہی ہے۔ اس کے خلاف پیش کی گئی واحد شہادت بھی بہت مشکوک تھی۔ ایڈیشنل سیشن جج ٹوبہ ٹیک سنگھ نے 1991 میں اسے سزائے موت سنائی اور لاہور ہائی کورٹ اور عدالتِ عظمیٰ میں اس کی اپیلیں مسترد ہو گئیں۔

اس کی ذہنی بیماری کی طویل تاریخ کے باوجود، صدر نے 1999 میں کنیزہ کی رحم کی اپیل 60 دیگر اپیلوں کے ساتھ مسترد کر دی۔

مقدمے کی تازہ ترین پیش رفتیں

عدالتِ عظمیٰ نے کنیزہ بی بی کے مقدمے کا ازخود نوٹس لیا جس کی سماعت 21 اپریل 2018 کو سابق چیف جسٹس کی سربراہی میں ایک دو رکنی بنچ نے کی۔

سماعت کے دوران، اس وقت کے چیف جسٹس نے کہا کہ "نہ تو شعور اور نہ ہی عقل ہمیں اجازت دیتی ہے کہ ہم ذہنی بیمار لوگوں کو پھانسی دیں۔" پھر عدالت نے کنیزہ بی بی کو پی آئی ایم ایچ منتقل کرنے اور اسے ممکنہ حد تک بہتر طبی سہولیات دینے کی ہدایت کی۔ عدالت نے کنیزہ کی ذہنی صحت کے معائنے کے لیے بورڈ کی تشکیل کا حکم بھی دیا۔ عدالت میں میڈیکل بورڈ کی رپورٹ جمع ہونے کے بعد عدالت کا پانچ رکنی بڑا بنچ اس کے مقدمے کی سماعت کرے گا۔

اُس وقت کے چیف جسٹس نے کہا کہ "نہ تو شعور اور نہ ہی عقل ہمیں اجازت دیتی ہے کہ ہم ذہنی بیمار لوگوں کو پھانسی دیں۔" پھر عدالت نے کنیزہ بی بی کو پی آئی ایم ایچ منتقل کرنے اور اسے ممکنہ حد تک بہتر طبی سہولیات دینے کی ہدایت کی۔ عدالت نے کنیزہ کی ذہنی صحت کے معائنے کے لیے بورڈ کی تشکیل کا حکم بھی دیا۔

کنیزہ بی بی کا مقدمہ ایک اور ذہنی بیمار قیدی امداد علی کے ساتھ نتھی کر دیا گیا ہے اور امکان ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ پاکستان میں ایک نظیر ثابت ہوگا اور ذہنی بیمار لوگوں کو پھانسی سے بچائے گا۔

سزا کی تبدیلی کی وجہ

ذہنی بیمار ملزمان بارہا پاکستان کے فوجداری نظامِ انصاف کے نقائص کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ فوجداری نظامِ انصاف میں، اور عام طور پر پورے پاکستان میں ذہنی امراض کے علاج معالجے اور تربیت کے فقدان کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگوں کی کبھی تشخیص تک نہیں ہو پاتی۔ درحقیقت، کئی ذہنی بیمار ملزمان کا ذہنی صحت کے ڈاکٹر کے ساتھ پہلا رابطہ جیل میں ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے رکن کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان نے انسانی حقوق کے کئی ایسے معاہدوں کی توثیق کی ہے جو ذہنی بیمار افراد کو حقوق اور تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان معاہدوں میں درج ذیل شامل ہیں:

آئی سی سی پی آر

کمیٹی برائے انسانی حقوق نے اپنے مختلف فیصلوں میں یہ قرار دیا ہے کہ ذہنی بیمار قیدیوں کو پھانسی دینا آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 6 اور 7 کے تحت ظالمانہ، غیر انسانی اور تضحیک آمیز سلوک کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی سختی سے ممانعت ہے۔

ایچ آر سی کے مطابق، کسی ایسے فرد کو جس کی ذہنی صحت "بہت زیادہ خراب ہو" کو موت کی کال کوٹھڑی میں بند رکھنا اور پھانسی دینا ظالمانہ، غیر انسانی، اور تضحیک آمیز سلوک کے برابر ہے۔

سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت

یو این کی معاشی و سماجی کونسل (ای سی او ایس او سی) نے 1984 میں "سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کی ضمانت دینے والے حفاظتی اقدامات" کی منظوری دی۔ اُسی برس، یو این کی جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے حفاظتی اقدامات کی منظوری دی۔ یہ حفاظتی اقدامات کم از کم معیارات کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں اُن ممالک میں لاگو ہونا ہے جہاں سزائے موت کا نظام نافذ ہے۔

تیسرے حفاظتی اقدام کے مطابق:

"جرم کے ارتکاب کے وقت 18 برس سے کم عمر لوگوں کو سزائے موت نہیں دی جائے گی، نہ ہی حاملہ عورت کو، ابھی ابھی ماں بننے والی عورت کو یا مخبوط الحواس آدمی کو پھانسی دی جائے گی۔"

تیسرا حفاظتی اقدام کی 1988 میں معاشی و سماجی کونسل نے ان الفاظ کے ساتھ پرزور تائید کی "ذہنی انحطاط یا انتہائی محدود ذہنی قابلیت میں مبتلا افراد"۔

کنیزہ بی بی کی ذہنی صحت

کنیزہ بی بی کی ذہنی صحت اسے سزائے موت کے فوری بعد بگڑنا شروع ہوگئی تھی۔ اس کی بگڑتی ہوئی صحت کے بارے میں فکرمند ہو کر جیل حکام نے اس کا مقدمہ وزارت داخلہ کو بھیجا اور 2006 میں اسے پنجاب انسٹیٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ منتقل کیا گیا جہاں باری باری بننے والے میڈیکل بورڈز نے تصدیق کی کہ وہ شیزوفرینیا کا شکار تھی۔

اپنی بیماری کی وجہ سے کنیزہ بی بی اپنے گردونواح کو سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت سے مکمل طور پر محروم ہوگئی ہے۔ بعض اوقات وہ خود کو کھانا کھلانے اور کپڑے پہننے کے قابل بھی نہیں رہتی۔ ہسپتال کے عملے نے تصدیق کی ہے کہ ان کے پاس زیرِ علاج رہنے کے دوران اس نے گذشتہ آٹھ برسوں میں ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

دورانِ حراست تشدد

کنیزہ بی بی کی سزا کا انحصار زیادہ تر اس بیان پر تھا جو اس نے 20 دن تک پولیس کی حراست میں تشدد ہونے پر دیا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ کے مطابق، تشدد اتنا شدید تھا کہ ایک مقام پر اسے ہسپتال داخل کروانا پڑا تھا۔ اسے بہت زیادہ مارا گیا اور بجلی کے جھٹکے لگائے گئے۔ اسے پنکھے کے ساتھ لٹکایا گیا اور شلوار میں چوہے چھوڑے گئے۔ کنیزہ نے 'اعترافِ جرم' کو چیلنج کیا تھا یہ کہہ کر کہ یہ زبردستی لیا گیا تھا مگر عدالت نے پھر بھی سزائے موت سناتے وقت اسی پر انحصار کیا۔

.....

خضر حیات (مرحوم)

سزائے موت کی کال کوٹھڑی میں بیتے برس: 16

ذہنی بیماری: پیرانائڈ شیزوفرینیا

موجودہ حالت: عدالتِ عظمیٰ کی جانب سے مقدمے کے ازخود نوٹس کو کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ خضر وفات پا گیا۔ مقدمہ ابھی تک عدالت عظمیٰ کے بڑے بنچ کے سامنے زیرِ غور ہے۔

مقدمے کا تاریخ وار احوال

2001

23 اکتوبر: خضر کو اپنے ساتھی پولیس افسر کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا گیا

2003

2 اپریل: ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ لاہور نے مجموعہ ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت خضر کو سزائے موت سنائی سنائی۔

کنیزہ بی بی کی سزا کا انحصار زیادہ تر اس بیان پر تھا جو اس نے 20 دن تک پولیس کی حراست میں تشدد ہونے پر دیا تھا۔ اس کے اہلِ خانہ کے مطابق، تشدد اتنا شدید تھا کہ ایک مقام پر اسے ہسپتال داخل کروانا پڑا تھا۔ اسے بہت زیادہ مارا گیا اور بجلی کے جھٹکے لگائے گئے۔ اسے پنکھے کے ساتھ لٹکایا گیا اور شلوار میں چوہے چھوڑے گئے۔ کنیزہ نے 'اعترافِ جرم' کو چیلنج کیا تھا یہ کہہ کر کہ یہ زبردستی لیا گیا تھا مگر عدالت نے پھر بھی سزائے موت سناتے وقت اسی پر انحصار کیا۔

2008

29 اکتوبر: سنٹرل جیل لاہور کے میڈیکل آفیسر اور سروسز ہسپتال لاہور کے ڈاکٹر نے خضر کو شیزوفرینیا کا مریض قرار دیا۔

2009

19 جنوری: ایل ایچ سی نے اپیل مسترد کی

2011

5 جنوری: عدالتِ عظمیٰ نے اپیل مسترد کی

2015

10 جون: سیشن کورٹ لاہور نے پہلے بلیک وارنٹ جاری کیے جن کے مطابق پھانسی کی تاریخ 16 جون طے پائی۔ 13 جون کو خضر کی والدہ نے صدر کو رحم کی اپیل دائر کی جس میں استدعا کی گئی کہ خضر کی بیماری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی سزا کم کی جائے

15 جون: ایل ایچ سی نے آخری لمحے پھانسی پر عملدرآمد روکا

23 جولائی: دوسرے بلیک وارنٹ جاری ہوئے جن کے مطابق پھانسی کی تاریخ 28 جولائی طے پائی

25 جولائی: پھانسی روکنے کا عدالتی حکم نامہ صادر ہوا

28 جولائی: یو این کے چار خصوصی مندوبین نے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ خضر کو پھانسی نہ دی جائے کیونکہ اس کی پھانسی انسانی حقوق کے عالمی قانون کی خلاف ورزی ہوگی

2016

18 مئی: عدالتی حکم سے تشکیل پانے والے ایک میڈیکل بورڈ اس نتیجے پر پہنچا کہ خضر "ذہنی اضطراب" اور "شیزوفرینیا" کا مریض ہے۔

2 نومبر: این سی ایچ آر نے خضر کے مقدمے کی تحقیقات

شروع کیں۔ این سی ایچ آر نے یہ اقدام جے پی پی کی درخواست پر کیا تھا

2017

10 جنوری: خضر کے تیسرے بلیک وارنٹ جاری ہوئے جن کے مطابق پھانسی کی تاریخ 17 جنوری طے پائی

12 جنوری: ایل ایچ سی نے پھانسی پر عمل درآمد روک دیا

2018

6 دسمبر: ایل ایچ سی کے ڈویژنل بنچ نے خضر کو ہسپتال منتقل کرنے کی درخواست مسترد کی

18 دسمبر: این سی ایچ آر نے حکام کو حکم دیا کہ عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے تک خضر کو پھانسی نہ دی جائے

2019

10 جنوری: خضر کے چوتھے بلیک وارنٹ جاری ہوئے اور پھانسی کی تاریخ 15 جنوری طے پائی

12 جنوری: عوامی احتجاج کے بعد سی جے نے ازخود نوٹس لیا اور خضر کی پھانسی پر عملدرآمد روک دیا

13 جنوری: یو این کے ماہرین نے اپیل کی کہ ذہنی بیمار قیدی کی پھانسی پر عملدرآمد روکا جائے

14 جنوری: ایس سی کے دو رکنی بنچ نے جے پی پی کی پٹیشن کی سماعت کی۔ خضر کا مقدمہ ایک بڑے بنچ کو منتقل کیا جو اس وقت کنیزہ اور امداد کا مقدمہ سن رہا ہے۔ ایک خصوصی میڈیکل بورڈ کے ذریعے خضر کے طبی معائنے کا حکم بھی صادر کیا۔

15 مارچ: خضر کو تشویشناک حالت میں جناح ہسپتال منتقل کیا گیا۔ اس نے کھانا پینا بند کر دیا تھا۔

22 مارچ: ہسپتال میں خضر وفات پا گیا۔

ذہنی بیمار قیدی خضر حیات نے 22 مارچ 2019 کو جناح ہسپتال میں وفات پائی جہاں وہ تشویشناک حالت میں زیرِ علاج تھا۔ اس نے 16 برس موت کی کال کوٹھڑی میں بسر کیے

خضر کو اپنے ساتھی پولیس افسر کے قتل کے جرم میں 2003 میں سزائے موت سنائی گئی۔ 2008 میں پہلی مرتبہ جیل حکام نے اسے پیرانائڈ شیزوفرینیا کا مریض قرار دیا جس پر "ادویات اثر نہیں کر پا رہی تھیں"۔ اس کی طبی رپورٹس میں بارہا کہا گیا کہ وہ واہموں، ذہنی اضطراب اور ذہنی عارضے کا شکار ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ خضر کو ذہنی بیماری پر قابو پانے کی انتہائی طاقتور اینٹی سائکاوٹک ادویات دی جا رہی ہیں۔

جنوری 2019 میں عدالتِ عظمیٰ نے خضر کے چوتھے بلیک وارنٹ معطل کیے جس کے بعد عدالتِ عظمیٰ کے ایک بڑے بنچ کو اس کا مقدمہ منتقل کیا گیا مگر مقدمے کی سماعت شروع ہونے سے قبل ہی اس کی وفات ہوگئی۔

پس منظر

خضر ایک گاؤں جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا، میں ایک پولیس اہلکار تھا۔ اسے جاننے والے کہتے ہیں کہ وہ بڑا شفیق انسان تھا مگر بہت "سست مزاج" اور ایسا آدمی جسے آسانی سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

وقوعے سے چند ماہ قبل وہ ایک مقامی "پیر" کے اثر میں آ گیا۔ وہ ایک ایسی روحانی شخصیت کے اثر میں آ گیا جس نے

> خضر کی ذہنی بیماری نے اسے شدید قسم کی جسمانی تکلیف بھی پہنچائی۔ جیل کے ریکارڈز سے معلوم ہوتا ہے کہ **2009** میں اس کے سر پر کاری ضربیں لگنے کی وجہ سے فوری آپریشن کے لیے اسے ایک سرکاری ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ ایک تنگ و تاریک کمرے میں **24** گھنٹے ایک واہمی اور مضطرب بندے کے ساتھ رہنے والے اس کے بیرک کے ساتھیوں نے اس پر پُرتشدد حملہ کیا۔ خضر کے وکیل اکثر جب اس سے ملتے تو اسے زخمی پاتے۔ آخرکار **2012** میں حملے اتنے لگاتار اور شدید ہو گئے کہ خضر کو جیل ہسپتال کے ایک الگ تھلگ سیل میں منتقل کرنا پڑا۔

اسے اپنی زمینیں اور دیگر املاک اپنے نام منتقل کرنے پر قائل کیا۔ اُس کے اثر میں، بالآخر خضر پر اپنے ساتھی پولیس افسر کو گولی مار کر قتل کرنے کا مقدمہ درج ہوا۔

ٹرائل کے دوران، خضر نے کہا کہ وہ بے قصور ہے مگر اس کا وکیل اپنے مؤکل کے دفاع میں ایک بھی شہادت یا گواہ نہ پیش کر سکا۔ آخرکار 2003 میں خضر کو سزائے موت سنا دی گئی۔ خضر کی ذہنی بیماری کی دستاویزی شہادت کے باوجود، عدالتیں اس کی اپیلیں مسترد کرتی رہیں۔

مقدمے کے حوالے سے حالیہ پیش رفتیں

دسمبر 2018 میں لاہور ہائی کورٹ نے خضر کو ہسپتال منتقل کرنے کی پٹیشن مسترد کی۔ عدالت کا کہنا تھا کہ "اس طرح کے جذباتی مسائل کی بنیاد پر پھانسی نہیں روکی جا سکتی۔" اور اس طرح عدالت نے ایک اور بلیک وارنٹ کی راہ ہموار کی۔ تب قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این سی ایچ آر) نے متعلقہ حکام کو حکم جاری کیا کہ عدالتِ عظمیٰ کی جانب سے معاملے کے تصفیے تک خضر کے بلیک وارنٹ جاری نہ کیے جائیں مگر جیل حکام نے این سی ایچ آر کے احکامات کی کھلی ورزی کرتے ہوئے 10 جنوری 2019 کو خضر کی پھانسی کے وارنٹ جاری کر دیے۔

عوام کے غم و غصے اور عدالتِ عظمیٰ کی بروقت مداخلت نے خضر کی زندگی بچائی۔ اس کی پھانسی ملتوی کر دی گئی اور مقدمہ ایس سی کی ایک بڑے بنچ کو منتقل کر دیا گیا جو اس وقت سزائے موت کے دو ذہنی بیمار قیدیوں امداد علی اور کنیزہ بی بی کے مقدمے کی سماعت کر رہا ہے جس کا فیصلہ اس جیسے مقدمات کے لیے نظیر ثابت ہوگا۔

بدقسمتی سے، خضر کے مقدمے کی سماعت شروع ہونے سے قبل اس کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی۔ 15 مارچ 2019 کو اسے تشویشناک حالت میں جناح ہسپتال لاہور منتقل کیا گیا جہاں 22 مارچ کی علی الصبح وہ وفات پا گیا۔

خضر کی ذہنی بیماری

جیل کے طبی ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ خضر کے ذہنی مرض کی علامتیں فروری 2008 میں نمودار ہونا شروع ہوگئی تھیں اگرچہ شیزوفرینیا کے بیج اس میں بہت عرصہ پہلے سے موجود تھے۔ ستمبر تک، اس کی بیماری اس قدر شدید ہوگئی کہ اسے ایک ماہ تک جیل کے ہسپتال میں رکھنا پڑا۔ تب سے اس کے لیے ریسپر ڈون جیسی اینٹی سائکاوٹک ادویات تجویز کی جاتی رہی ہیں۔

خضر کی ذہنی حالت اس حد تک بگڑ گئی کہ وہ سمجھتا تھا کہ چاند پر امریکیوں کے اترنے کی وجہ سے دنیا جلد ہی ختم ہونے والی ہے اور چاند کے زمین پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مسائل کا حل اس کی بیرک کے بیت الخلاء میں ہے جس کی وجہ زمین کے ساتھ اس کے بیت الخلاء کا خصوصی تعلق ہے۔ اپنے آخری برسوں میں، خضر اپنے جسم کا خیال رکھنے کے قابل نہیں تھا، اکثر گندے کپڑے پہنتا تھا، مکمل طور پر برہنہ ہو جاتا تھا اور خوراک اور فضلہ اپنی بیرک سے باہر پھینکتا تھا۔

خضر کی ذہنی بیماری نے اسے شدید قسم کی جسمانی تکلیف بھی پہنچائی۔ جیل کے ریکارڈز سے معلوم ہوتا ہے کہ 2009 میں اس کے سر پر کاری ضربیں لگنے کی وجہ سے فوری آپریشن کے لیے اسے ایک سرکاری ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ ایک تنگ و تاریک کمرے میں 24 گھنٹے ایک واہمی اور مضطرب بندے کے ساتھ رہنے والے اس کے بیرک کے ساتھیوں نے اس پر پُرتشدد حملہ کیا۔ خضر کے وکیل اکثر جب اس سے ملتے تو اسے زخمی پاتے۔ آخرکار 2012 میں حملے اتنے لگاتار اور شدید ہو گئے کہ خضر کو جیل ہسپتال کے ایک الگ تھلگ سیل میں منتقل کرنا پڑا۔

2009 کے اوائل میں، خضر کی والدہ نے درخواست کی

کہ اس کے بیٹے کو باقاعدہ صحت کے کسی ادارے میں منتقل کیا جائے جہاں اس کا علاج ہو سکے۔ ان کی درخواست سُنی اَن سُنی کر دی گئی۔

خضر نے اپنی زندگی کے آخری چھ برس ہسپتال کے سیل میں قیدِ تنہائی میں گزارے باوجود اس حقیقت کے کہ ذہنی بیمار قیدیوں کے لیے سزا نہیں ہے یہاں تک کہ انتہائی سنگین جرائم کے لیے بھی۔

"اگر کوئی بندہ ذہنی بیمار ہے تو آپ اسے پھانسی کیسے دے سکتے ہیں؟"

سابق چیف جسٹس ثاقب نثار

سزائے موت کے قیدی ذہنی بیمار کنیزہ بی بی اور امداد علی کے مقدمے کی سماعت کے دوران

سزا کی تبدیلی کی وجہ

ذہنی بیمار ملزمان بارہا پاکستان کے فوجداری نظامِ انصاف کے نقائص کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ فوجداری نظامِ انصاف میں، اور عام طور پر پورے پاکستان میں ذہنی امراض کے علاج معالجے اور تربیت کے فقدان کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگوں کی کبھی تشخیص تک نہیں ہو پاتی۔ درحقیقت، کئی ذہنی بیمار ملزمان کا ذہنی صحت کے ڈاکٹر کے ساتھ پہلا رابطہ جیل میں ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے رکن کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان نے انسانی حقوق کے کئی ایسے معاہدوں کی توثیق کی ہے جو ذہنی بیمار افراد کو حقوق اور تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان معاہدوں میں درج ذیل شامل ہیں:

آئی سی سی پی آر

کونسل برائے انسانی حقوق نے اپنے مختلف فیصلوں بشمول آر۔ ایس بنام ترینیداد اور تباگو (96/684) میں یہ قرار دیا ہے کہ کہ ذہنی بیمار قیدیوں کو پھانسی دینا عالمی میثاق برائے شہریتی و سیاسی حقوق (آئی سی سی پی آر) جس کا پاکستان 2010 میں فریق بنا تھا، کے آرٹیکل 6 اور 7 کے تحت ظالمانہ، غیر انسانی اور تضحیک آمیز سلوک کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی سختی سے ممانعت ہے۔

جولائی 2015 میں، یواین کے چار خصوصی مندوبین نے حکومت پاکستان سے اپیل کی کہ خضر کی پھانسی روکی جائے کیونکہ اسے پھانسی دینا انسانی حقوق کے عالمی قوانین کی خلاف ورزی ہوگا۔ صحت کے حق پر یواین کے خصوصی مندوب دائنیس پورس نے کہا، "ہم پاکستان کے حکام سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ خضر اور ذہنی معذوریوں کے شکار سزائے موت کے دیگر قیدیوں کے صحت کے حق کا تحفظ کریں، ان کی قانونی صورت حال سے بالاتر ہو کر، اور ان کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں صحت کی سہولیات تک رسائی دیں۔"

سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت

یواین کی معاشی و سماجی کونسل (ای سی او ایس او سی) نے 1984 میں "سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کی ضمانت دینے والے حفاظتی اقدامات" کی منظوری دی۔ اُسی برس۔ یواین کی جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے حفاظتی اقدامات کی منظوری دی۔ یہ حفاظتی اقدامات کم از کم معیارات کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں اُن ممالک میں لاگو ہونا ہے جہاں سزائے موت کا نظام نافذ ہے۔

تیسرے حفاظتی اقدام کے مطابق:

"جرم کے ارتکاب کے وقت 18 برس سے کم عمر لوگوں کو سزائے موت نہیں دی جائے گی، نہ ہی حاملہ عورت کو، ابھی ابھی ماں بننے والی عورت کو یا مخبوط الحواس آدمی کو پھانسی دی جائے گی۔"

تیسرا حفاظتی اقدام کی 1988 میں معاشی و سماجی کونسل نے ان الفاظ کے ساتھ پرزور تائید کی "ذہنی انحطاط یا انتہائی محدود ذہنی قابلیت میں مبتلا افراد"۔

.....

امداد علی

موت کی کال کوٹھڑی میں بیتے برس: 17

ذہنی بیماری: پیرانائڈ شیزوفرینیا

قید خانہ: ڈسٹرکٹ جیل وہاڑی

موجودہ حالت: مقدمہ عدالتِ عظمیٰ کے ایک بڑے بنچ کے سامنے زیرِ غور ہے

مقدمے کیا تاریخ وار احوال

21:2001 جنوری کو مبینہ جرم وقوع پذیر ہوا

2002: 29 جولائی: عدالت نے پی پی سی کی دفعہ 302(ب) کے تحت امداد کو سزائے موت سنائی۔

7:2008 نومبر: ایل ایچ سی نے اپیل مسترد کی

19:2015 اکتوبر: ایس سی نے اپیل مسترد کی

23:2016 جولائی: بلیک وارنٹ جاری ہوئے؛ پھانسی کی تاریخ 26 جولائی طے پائی

25 جولائی: امداد کی بیوی نے سیشن کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کی۔ عدالت نے حکمِ امتناعی جاری کیا۔

23 اگست: سیشن کورٹ نے پٹیشن مسترد کر دی

16 ستمبر: دوسرے بلیک وارنٹ جاری ہوئے؛ پھانسی کی تاریخ 20 ستمبر طے پائی

19 ستمبر: امداد کی میڈیکل رپورٹ کے ہمراہ رحم کی پٹیشن دائر ہوئی، موت کے وارنٹ معطل ہو گئے

> خضر کی ذہنی حالت اس حد تک بگڑ گئی کہ وہ سمجھتا تھا کہ چاند پر امریکیوں کے اترنے کی وجہ سے دنیا جلد ہی ختم ہونے والی ہے اور چاند کے زمین پر منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مسائل کا حل اس کی بیرک کے بیت الخلاء میں ہے جس کی وجہ زمین کے ساتھ اس کے بیت الخلاء کا خصوصی تعلق ہے۔ اپنے آخری برسوں میں، خضر اپنے جسم کا خیال رکھنے کے قابل نہیں تھا، اکثر گندے کپڑے پہنتا تھا، مکمل طور پر برہنہ ہو جاتا تھا اور خوراک اور فضلہ اپنی بیرک سے باہر پھینکتا تھا۔

27 ستمبر: ایس سی نے یہ کہہ کر پٹیشن مسترد کر دی کہ شیزوفرینیا ذہنی بیماری نہیں ہے

27 اکتوبر: تیسرے بلیک وارنٹ جاری ہوئے؛ پھانسی کی تاریخ 2 نومبر طے پائی

31 اکتوبر: ایس سی نے پھانسی پر عملدرآمد روک دیا

12 نومبر: ایس سی میں نظر ثانی کی اپیل دائر ہوئی

14 نومبر: ایس سی نے میڈیکل بورڈ بنانے کا حکم دیا

2018

2 اپریل: ایس سی نے ذہنی بیمار قیدی کنیزہ بی بی کے مقدمے کا ازخود نوٹس لیا اور امداد کا مقدمہ اس کے ساتھ نتھی کر دیا

23 اکتوبر: ایس سی نے امداد اور کنیزہ کے طبی معائنے کا حکم دیا

امداد علی، ایک ذہنی بیمار آدمی نے بغیر کسی مناسب علاج معالجے کے 17 برس موت کی کال کوٹھڑی میں گزارے ہیں۔ اسے 2002 میں ایک مذہبی رہنما کو گولی مار کر قتل کرنے کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔

جیل میں قید کے دوران، اسے بارہا شیزوفرینیا کا مریض قرار دیا گیا، اس کی میڈیکل رپورٹس کئی برسوں سے اس امر کی تصدیق کر رہی ہیں کہ وہ ذہنی عارضے میں مبتلا ہے اور اس کے مرض کی نوعیت ایسی ہے کہ "اس کی بیماری علاج کی بہت زیادہ مزاحمت کرتی ہے"۔

امداد علی نے اپنی ذہنی بیماری کی نوعیت کی وجہ سے آخری چار برس ڈسٹرکٹ جیل وہاڑی کے ہسپتال میں قیدِ تنہائی میں گزارے ہیں۔

"اگر کوئی بندہ ذہنی بیمار ہے تو آپ اسے پھانسی کیسے دے سکتے ہیں؟"

سابق چیف جسٹس ثاقب نثار

سزائے موت کے قیدی ذہنی بیمار کنیزہ بی بی اور امداد علی کے مقدمے کی سماعت کے دوران

پس منظر

امداد کا تعلق انتہائی غریب گھرانے سے ہے۔ اس کے رشتہ داروں نے اس میں بیماری کی علامات پہلی دفعہ 1998 میں دیکھیں جب وہ سعودی عرب سے کام کے دورے سے واپس آیا تھا۔ ان کے مطابق، وہ خود سے یا چیزوں سے بات کرتے ہوئے پایا جاتا تھا۔ جب 2001 میں اسے ایک مذہبی رہنما کے قتل میں سزا ہوئی تو اس وقت امداد نجی میڈیکل کنسلٹنٹ کی خدمات لینے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا جو عدالت کو اس کی بیماری کی تفصیلات سے آگاہ کر سکتے۔ بالآخر اسے موت کی سزا سنائی گئی۔

امداد کی بیوی نے ٹرائل کورٹ میں اس کی ذہنی حالت کا نکتہ اٹھایا تھا مگر استغاثہ کا دعویٰ تھا کہ اس نے ان تمام سوالوں کے منطقی جواب دیے ہیں جو اس سے کیے گئے تھے۔ جج بھی امداد کو سزائے موت سناتے وقت اپنے فیصلے میں اس کی ذہنی بیماری کا ذکر کرنے میں ناکام رہا تھا۔

ذہنی بیماری کی واضح شہادت کے باوجود، عدالتیں امداد کی اپیلیں مسترد کرتی رہیں۔ اس کی رحم کی پٹیشنیں مسترد ہو گئیں اور 2016 میں تین بار اس کی موت کے وارنٹ جاری ہوئے۔

مقدمے کی تازہ ترین صورتِ حال

امداد کے مقدمے کو 2016 میں اُس وقت وقت شہرت ملی جب عدالتِ عظمیٰ نے یہ کہتے ہوئے اس کی اپیل خارج کر دی کہ "شیزوفرینیا قابل علاج بیماری ہے۔" اور یہ ایک ذہنی بیماری نہیں ہے۔ مگر عوامی احتجاج، اس کے وکیلوں کی جانب سے نئی پٹیشن اور حکومتِ پنجاب کی طرف سے نظرثانی کی اپیل کے بعد اس کے تیسرے بلیک وارنٹ پر عملدرآمد روک دیا گیا۔

اپریل 2018 میں، عدالتِ عظمیٰ نے ایک اور ذہنی بیمار قیدی کنیزہ بی بی کے مقدمے کا ازخود نوٹس لیا اور امداد کے مقدمے کو اس کے ساتھ نتھی کر دیا۔ دونوں قیدیوں کے تازہ طبی معائنے کا حکم دیتے ہوئے عدالت نے کہا کہ اس مقدمے کا فیصلہ سزائے موت کے تمام ذہنی بیمار قیدیوں کے لیے ایک نظیر ثابت ہوگا۔

"نہ تو عقل اور نہ ہی شعور مجھے اجازت دیتا ہے کہ ہم ایک ذہنی بیمار یا معذور شخص کو پھانسی دیں۔" اس وقت کے چیف جسٹس میاں ثاقب نثار نے مقدمے کی سماعت کے دوران کہا، یہ یاد کرتے ہوئے کہ عالمی قانونی نظام ذہنی بیمار قیدیوں کو پھانسی دینے کی واضح ممانعت کرتے ہیں۔

امداد کی ذہنی بیماری

امداد علی میں پیرانائڈ شیزوفرینیا کی پہلی دفعہ تشخیص 2012 میں جیل حکام نے کی تھی حالانکہ 2009 سے اس کے میڈیکل ریکارڈز ظاہر کرتے ہیں کہ اسے نفسیاتی عارضے لاحق تھے۔ اس کے خاندان اور ہمسایوں سمیت اسے جاننے والے کہتے ہیں کہ واقعہ پیش آنے سے کئی برس پہلے اس میں ذہنی مرض کی علامات ظاہر ہوتی تھیں۔ امداد کے جیل کے میڈیکل ریکارڈ بتاتے ہیں کہ تشخیص کے بعد وہ سنگین ذہنی بیماری کے لیے مسلسل علاج کرواتا رہا ہے، ایک نفسیات دان اسے مستقل دیکھتے رہے ہیں اور اس کے لیے طاقتور اینٹی سائیکوٹک ادویات تجویز کرتے ہیں۔

> ذہنی بیمار ملزمان بارہا پاکستان کے فوجداری نظامِ انصاف کے نقائص کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ فوجداری نظامِ انصاف میں، اور عام طور پر پورے پاکستان میں ذہنی امراض کے علاج معالجے اور تربیت کے فقدان کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگوں کی کبھی تشخیص تک نہیں ہو پاتی۔ درحقیقت، کئی ذہنی بیمار ملزمان کا ذہنی صحت کے ڈاکٹر کے ساتھ پہلا رابطہ جیل میں ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے رکن کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان نے انسانی حقوق کے کئی ایسے معاہدوں کی توثیق کی ہے جو ذہنی بیمار افراد کو حقوق اور تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

سزا کی تبدیلی کی وجہ

ذہنی بیمار ملزمان بارہا پاکستان کے فوجداری نظامِ انصاف کے نقائص کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ فوجداری نظامِ انصاف میں، اور عام طور پر پورے پاکستان میں ذہنی امراض کے علاج معالجے اور تربیت کے فقدان کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگوں کی کبھی تشخیص تک نہیں ہو پاتی۔ درحقیقت، کئی ذہنی بیمار ملزمان کا ذہنی صحت کے ڈاکٹر کے ساتھ پہلا رابطہ جیل میں ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے رکن کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان نے انسانی حقوق کے کئی ایسے معاہدوں کی توثیق کی ہے جو ذہنی بیمار افراد کو حقوق اور تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان معاہدوں میں درج ذیل شامل ہیں:

آئی سی سی پی آر

کمیٹی برائے انسانی حقوق نے اپنے مختلف فیصلوں میں یہ قرار دیا ہے کہ ذہنی بیمار قیدیوں کو پھانسی دینا آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 6 اور 7 کے تحت ظالمانہ، غیرانسانی اور تضحیک آمیز سلوک کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی سختی سے ممانعت ہے۔

ایچ آر سی کے مطابق، کسی ایسے فرد کو جس کی ذہنی صحت خراب ہو موت کی کال کوٹھڑی میں بند رکھنا اور پھانسی دینا ظالمانہ، غیرانسانی، اور تضحیک آمیز سلوک کے برابر ہے۔

سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت

یو این کی معاشی و سماجی کونسل (ای سی او ایس او سی) نے 1984 میں "سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کی ضمانت دینے والے حفاظتی اقدامات" کی منظوری دی۔ اُسی برس، یو این کی جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے حفاظتی اقدامات کی منظوری دی۔ یہ حفاظتی اقدامات کم از کم معیارات کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں اُن ممالک میں لاگو ہونا ہے جہاں سزائے موت کا نظام نافذ ہے۔

تیسرے حفاظتی اقدام کے مطابق:

"جرم کے ارتکاب کے وقت 18 برس سے کم عمر لوگوں کو سزائے موت نہیں دی جائے گی، نہ ہی حاملہ عورت کو، ابھی ابھی ماں بننے والی عورت کو یا مخبوط الحواس آدمی کو پھانسی دی جائے گی۔"

تیسرا حفاظتی اقدام کی 1988 میں معاشی و سماجی کونسل نے ان الفاظ کے ساتھ پرزور تائید کی "ذہنی انحطاط یا انتہائی محدود ذہنی قابلیت میں مبتلا افراد"۔

.....

شیراز بٹ

سزائے موت کی کال کوٹھڑی میں بیتے برس: 7

ذہنی بیماری: شیزوفرینیا

قید خانہ: ہسپتال سیل، سنٹرل جیل لاہور

موجودہ حالت: شیراز کی فوجداری اپیل عدالتِ عظمیٰ میں زیرِ التوا ہے۔

مقدمے کی تاریخ وار احوال:

2008

29 جنوری: مبینہ جرم سرزد ہوا

2012

20 فروری: ٹرائل کورٹ نے ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 (ب) کے تحت شیراز کو سزائے موت سنائی۔

2013

9 اکتوبر: سروسز ہسپتال کے ڈاکٹر نے شیراز کا معائنہ کیا

اور اسے غیر معمولی رویے، سمعی وہمے کا مظاہرہ کرتے اور غیر متعلقہ گفتگو کرتے پایا۔

2014

29 جنوری: سنٹرل جیل ہسپتال نے اینٹی سائکوٹک دوائی ریسپر یڈون تجویز کی۔

2016

20 جون: لاہور ہائی کورٹ نے شیراز کی اپیل مسترد کی

اگست: عدالتِ عظمیٰ میں اپیل دائر کی گئی۔

19 نومبر: سنٹرل جیل لاہور نے شیراز کا ایک بار پھر معائنہ کیا جس سے پتہ چلا کہ شراز واہموں، غیر متعلقہ گفتگو، نیند سے محرومی اور اپنا خیال رکھنے کی صلاحیت سے محرومی کا شکار ہے۔

شیراز بٹ کو اپنی والدہ کو لاہور میں اپنی رہائش گاہ پر تیز دھار آلے سے قتل کرنے کے الزام میں 2012 میں سزائے موت سنائی گئی۔ واقعہ شیراز کو سزائے موت سنانے سے چار برس قبل پیش آیا تھا۔ اس کی ذہنی بیماری کی علامات وقوعہ پیش آنے سے بہت پہلے ظاہر ہوئی تھیں مگر جیل حکام نے 2016 میں اسے پہلی بار شیزوفرینیا کا مریض قرار دیا۔

گذشتہ برسوں کے دوران کئی طبی معائنوں نے اس کی ذہنی بیماری کی تصدیق کی ہے مگر اس کے باوجود اسے سزائے موت کی کال کوٹھڑی میں رکھا جا رہا ہے۔

اِس وقت وہ سنٹرل جیل لاہور (کوٹ لکھپت جیل) میں بند ہے۔

"اگر کوئی بندہ ذہنی بیمار ہے تو آپ اسے پھانسی کیسے دے سکتے ہیں؟"

سابق چیف جسٹس ثاقب نثار

پس منظر

شیراز کو 2008 میں لاہور میں اپنی رہائش گاہ پر اپنی والدہ کو قتل کرنے کے الزام میں 2012 میں سزائے موت ہوئی۔ اگرچہ اسے شیزوفرینیا کا مریض بہت بعد میں قرار دیا گیا، اس کی ذہنی بیماری کی علامات بہت پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ شیراز نے وقوعے سے ایک ہفتہ قبل بھی اپنے والدین پر چاقو سے حملہ کیا تھا۔ اس کے والدین نے پولیس کو اس حملے کی اطلاع دی تھی اور اسے پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ بھی منتقل کیا تھا مگر شیراز نے علاج کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ شیراز نے کئی بار دعویٰ کیا کہ اس پر "جنون" طاری تھا جس نے اسے یہ جرم کرنے پر مجبور کیا تھا۔

وہ سات برسوں سے جیل میں ہے باوجود اس کے کہ کئی طبی رپورٹس نے اسے شدید ذہنی بیمار شخص قرار دیا ہے۔ اس کی شدید حالت کے باوجود، لاہور ہائی کورٹ نے 2016 میں اس کی اپیل مسترد کر دی اور سزائے موت کو برقرار رکھا۔

عدالتِ عظمیٰ میں اس کی اپیل زیرِ التواء ہے۔

شیراز کی ذہنی بیماری

شیراز کے جیل میڈیکل ریکارڈز کے مطابق، پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ کے ماہرینِ نفسیات اس کے معائنے کے لیے اس سے سات بار مل چکے ہیں۔ 2013 سے 2017 کے دوران ہونے والی طبی تشخیصوں اور معائنوں کی رپورٹس میں مسلسل یہی بتایا گیا ہے کہ شیراز شدید قسم کے "شیزوفرینیا" کا شکار ہے۔

گذشتہ برسوں میں، قید کے برے حالات اور طاقتور اینٹی سائکوٹک ادویات نے شیراز کی صحت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ وہ مسلسل سمعی و بصری واہموں کا شکار ہے، زمان و مکان کے شعور سے محروم ہے اور اکثر تیسرے فرد کے طور پر اپنے بارے میں بولتا رہتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسے ایسی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو اسے اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں معلومات دیتی ہیں۔

شیراز شدید قسم کے ذہنی مرض کا شکار ہے جسے کسی ذہنی صحت کے ہسپتال میں ہونا چاہیے نا کہ پاکستانی و عالمی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تختہ دار پر۔

سزا کی تبدیلی کی وجہ

ذہنی بیمار ملزمان بارہا پاکستان کے فوجداری نظامِ انصاف کے نقائص کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ فوجداری نظامِ انصاف میں، اور عام طور پر پورے پاکستان میں ذہنی امراض کے علاج معالجے اور تربیت کے فقدان کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگوں کی کبھی تشخیص تک نہیں ہو پاتی۔ درحقیقت، کئی ذہنی بیمار ملزمان کا ذہنی صحت کے ڈاکٹر کے ساتھ پہلا رابطہ جیل میں ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے رکن کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان نے انسانی حقوق کے کئی ایسے معاہدوں کی توثیق کی ہے جو ذہنی بیمار افراد کو حقوق اور تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان معاہدوں میں درج ذیل شامل ہیں:

آئی سی سی پی آر

کمیٹی برائے انسانی حقوق نے اپنے مختلف فیصلوں میں یہ قرار دیا ہے کہ ذہنی بیمار قیدیوں کو پھانسی دینا آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 6 اور 7 کے تحت ظالمانہ، غیر انسانی اور تضحیک آمیز سلوک کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی سختی سے ممانعت ہے۔

ایچ آر سی کے مطابق، کسی ایسے فرد کو جس کی ذہنی صحت بہت زیادہ خراب ہو کو، موت کی کال کوٹھڑی میں بند رکھنا اور پھانسی دینا ظالمانہ، غیر انسانی، اور تضحیک آمیز سلوک کے برابر ہے۔

سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت

یو این کی معاشی و سماجی کونسل (ای سی او ایس او سی) نے 1984 میں "سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کی ضمانت دینے والے حفاظتی اقدامات" کی منظوری دی۔ اُسی برس، یو این کی جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے حفاظتی اقدامات کی منظوری دی۔ یہ حفاظتی اقدامات کم از کم معیارات کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں اُن ممالک میں لاگو ہونا ہے جہاں سزائے موت کا نظام نافذ ہے۔

تیسرے حفاظتی اقدام کے مطابق:

"جرم کے ارتکاب کے وقت 18 برس سے کم عمر لوگوں کو سزائے موت نہیں دی جائے گی، نہ ہی حاملہ عورت کو، ابھی ابھی ماں بننے والی عورت کو یا مخبوط الحواس آدمی کو پھانسی دی جائے گی۔"

تیسرے حفاظتی اقدام کی 1988 میں معاشی و سماجی کونسل نے ان الفاظ کے ساتھ پرزور تائید کی "ذہنی انحطاط یا انتہائی محدود ذہنی قابلیت میں مبتلا افراد"۔

.....

محمد سلیم

سزائے موت کی کال کوٹھڑی میں بیتے برس: 14

ذہنی بیماری: شیزوفرینیا

قید خانہ: سنٹرل جیل لاہور

موجودہ حالت: ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لاہور کے سامنے مقدمہ زیرِ غور ہے

مقدمے کا تاریخ وار احوال

2001

22 دسمبر: سلیم احمد کو گرفتار کیا گیا

2002

16 جنوری: ٹرائل کورٹ نے طبی معائنے کا حکم دیا

8 جون: ہسپتال کے ماہرِ نفسیات کی رپورٹس میں کہا گیا کہ سلیم ٹرائل کے لیے موزوں ہے

2004

30 اکتوبر: سلیم کو مجرم قرار دیا گیا اور ضابطہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 302 (ب) کے تحت سزائے موت سنائی گئی

2013

8 مئی: ایل ایچ سی نے اپیل مسترد کر دی

25 ستمبر: سلیم کو شیزوفرینیا کا مریض قرار دیا گیا اور اس کے لیے ریسپر ڈون سمیت اینٹی سائکوٹک ادویات تجویز کی گئیں۔

2017

24 مئی: عدالتِ عظمیٰ نے اپیل مسترد کر دی

19 اکتوبر: صدر نے رحم کی پٹیشن مسترد کر دی

31 اکتوبر: بلیک وارنٹ جاری ہوئے، پھانسی کی تاریخ 7 نومبر طے پائی

2 نومبر: پھانسی پر عملدرآمد روکنے کے لیے این ایچ سی آر میں اپیل دائر ہوئی

4 نومبر: سیشن جج نے سلیم کی ذہنی بیماری کی بنیاد پر پھانسی پر عملدرآمد روک دیا۔ عدالت نے سلیم کی صحت کے معائنے کا حکم بھی دیا

2018

12 جون: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ (پی آئی ایم ایچ) کے طبی بورڈ نے کہا کہ سلیم کو دیرینہ شیزوفرینیا لاحق ہے

26 نومبر: عدالت کے تشکیل کردہ طبی بورڈ نے تصدیق کی کہ "سلیم کو دیرینہ شیزوفرینیا لاحق ہے۔"

محمد سلیم، ایک ذہنی بیمار قیدی 14 برسوں سے جیل میں بند ہے۔ اس پر الزام ہے کہ اس نے 2001 میں پیسے دینے سے انکار پر اپنی بہن کو گولی مار کر قتل کیا تھا۔ تحقیقاتی افسر نے اپنی رپورٹ میں سلیم کی ذہنی بیماری کا ذکر کیا اور ٹرائل کورٹ نے تسلیم کیا کہ وہ "مخبوط الحواس" تھا "زمان و مکان کے شعور سے عاری" تھا مگر اس کے باوجود 2004 میں اسے سزائے موت دی گئی۔

سلیم میں 2013 میں پہلی بار "ذہنی بیماری" کی تشخیص ہوئی اور اس وقت سے اس کے لیے اینٹی سائکوٹک ادویات تجویز کی جا رہی ہیں۔

عدالت کے تشکیل کردہ میڈیکل بورڈ نے ابھی حال ہی میں اس کی ذہنی بیماری کی تصدیق کی ہے اور اسے پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ (پی آئی ایم ایچ) بھیجنے کی سفارش کی ہے مگر پھر بھی اسے سنٹرل جیل لاہور (کوٹ لکھپت جیل) کے ہسپتال سیل میں رکھا جا رہا ہے۔

"اگر کوئی بندہ ذہنی بیمار ہے تو آپ اسے پھانسی کیسے دے سکتے ہیں؟"

سابق چیف جسٹس ثاقب نثار

ذہنی بیمار قیدیوں کنیزہ بی بی اور امداد علی کے مقدمے کی سماعت کے دوران

پس منظر

محمد سلیم کی ذہنی بیماری کی لمبی چوڑی تاریخ ہے۔ جیل حکام نے 2013 میں اسے پہلی بار شیزوفرینیا کا مریض قرار دیا حالانکہ اس کی بیماری کے بیج بہت پہلے ہی اُگ چکے تھے۔ سلیم کے خاندان کو گرفتاری سے قبل اس کی بیماری کا پتہ تھا اور وہ اسے نفسیاتی بیماریوں کے ہسپتالوں میں لے کر گئے تھے جہاں اس کے دماغ کو بجلی کے جھٹکے لگائے گئے تھے۔

2001 میں سلیم کو اپنی بہن کو گولی مار کر قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ واقعے کے بعد، اس کے خاندان نے اسے لاوارث چھوڑ دیا اور اسے ریاست کا مقرر کردہ وکیل کرنا پڑا۔ استغاثہ نے تو 10 گواہ پیش کیے مگر اس کا وکیل کوئی ایک بھی گواہ پیش نہ کر سکا۔ وکیل یہ بتانے میں بھی ناکام رہا کہ سلیم کے خاندان کو ماضی میں اس کی ذہنی بیماری کا علم تھا۔

شروع سے ہی، ٹرائل اور سزا کے ہر مرحلے پر اس کی ذہنی صحت کے بارے میں شکوک پائے گئے تھے۔ تحقیقاتی افسر کی شہادت کے مطابق، اُسے سلیم کی ذہنی بیماری کا علم تھا اور یہاں تک کہ ٹرائل کورٹ نے کئی مرتبہ مشاہدہ کیا کہ وہ "پاگل پن کی باتیں" کر رہا تھا اور "زمان و مکان کے شعور سے عاری" تھا۔ ان مشاہدات کی وجہ سے سلیم کو مینٹل ہسپتال لاہور میں ایک میڈیکل بورڈ کے حوالے کیا گیا جس نے پھر بھی 2002 میں اسے ٹرائل کے لیے موزوں قرار دیا۔

ذہنی بیماری کی اپیل کے باوجود، عدالت نے 2004 میں اسے سزائے موت سنائی۔

2017 میں موت کا پروانہ جاری ہونے کے بعد سلیم پھانسی گھاٹ کے بہت قریب آ گیا تھا۔ مگر جسٹس پراجیکٹ پاکستان کی جانب سے اس کی ذہنی بیماری کی بنیاد پر دائر ہونے والی پٹیشن پر سیشن کورٹ نے آخری لمحے پر پھانسی روک دی۔ عدالت نے سلیم کے معائنے کے لیے ایک طبی بورڈ قائم کرنے کا حکم بھی دیا۔

نومبر 2018 میں، میڈیکل بورڈ نے تصدیق کی کہ سلیم "دیرینہ شیزوفرینیا" کا شکار ہے اور اسے "مستقل علاج کی ضرورت" ہے اور تجویز کیا کہ اسے علاج کے لیے پنجاب مینٹل ہیلتھ انسٹی ٹیوٹ منتقل کیا جائے۔

کمزور طبی حالت اور قید کے سخت حالات کی بدولت سلیم کی صحت ہر گزرتے دن کے ساتھ خراب ہو رہی ہے۔ اسے ذہنی صحت کے ادارے میں ہونا چاہیے نا کہ پاکستانی اور عالمی قوانین کی روگردانی میں تختہ دار پر۔

سزا کی تبدیلی کی وجہ

ذہنی بیمار ملزمان بارہا پاکستان کے فوجداری نظامِ انصاف کے نقائص کی بھینٹ چڑھے ہیں۔ فوجداری نظامِ انصاف میں، اور عام طور پر پورے پاکستان میں ذہنی امراض کے علاج معالجے اور تربیت کے فقدان کا مطلب ہے کہ بہت سے لوگوں کی کبھی تشخیص تک نہیں ہو پاتی۔ درحقیقت، کئی ذہنی بیمار ملزمان کا ذہنی صحت کے ڈاکٹر کے ساتھ پہلا رابطہ جیل میں ہوتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے رکن کی حیثیت سے حکومتِ پاکستان نے انسانی حقوق کے کئی ایسے معاہدوں کی توثیق کی ہے جو ذہنی بیمار افراد کو حقوق اور تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ ان معاہدوں میں درج ذیل شامل ہیں:

آئی سی سی پی آر

کمیٹی برائے انسانی حقوق نے اپنے مختلف فیصلوں میں یہ قرار دیا ہے کہ ذہنی بیمار قیدیوں کو پھانسی دینا آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 6 اور 7 کے تحت ظالمانہ، غیر انسانی اور تضحیک آمیز سلوک کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی سختی سے ممانعت ہے۔

ایچ آر سی کے مطابق، کسی ایسے فرد کو جس کی ذہنی صحت "بہت زیادہ خراب ہو" کو موت کی کال کوٹھڑی میں بند رکھنا اور پھانسی دینا ظالمانہ، غیر انسانی، اور تضحیک آمیز سلوک کے برابر ہے۔

سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت

یو این کی معاشی و سماجی کونسل (ای سی او ایس او سی) نے 1984 میں "سزائے موت کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کی ضمانت دینے والے حفاظتی اقدامات" کی منظوری دی۔ اُسی برس، یو این کی جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے حفاظتی اقدامات کی منظوری دی۔ یہ حفاظتی اقدامات کم از کم معیارات کا درجہ رکھتے ہیں جنہیں اُن ممالک میں لاگو ہونا ہے جہاں سزائے موت کا نظام نافذ ہے۔

تیسرے حفاظتی اقدام کے مطابق:

"جرم کے ارتکاب کے وقت 18 برس سے کم عمر لوگوں کو سزائے موت نہیں دی جائے گی، نہ ہی حاملہ عورت کو، ابھی ابھی ماں بننے والی عورت کو یا مخبوط الحواس آدمی کو پھانسی دی جائے گی۔"

تیسرے حفاظتی اقدام کی 1988 میں معاشی و سماجی کونسل نے ان الفاظ کے ساتھ پرزور تائید کی "ذہنی انحطاط یا انتہائی محدود ذہنی قابلیت میں مبتلا افراد"۔

2017 میں موت کا پروانہ جاری ہونے کے بعد سلیم پھانسی گھاٹ کے بہت قریب آ گیا تھا۔ مگر جسٹس پراجیکٹ پاکستان کی جانب سے اس کی ذہنی بیماری کی بنیاد پر دائر ہونے والی پٹیشن پر سیشن کورٹ نے آخری لمحے پر پھانسی روک دی۔ عدالت نے سلیم کے معائنے کے لیے ایک طبی بورڈ قائم کرنے کا حکم بھی دیا۔

سال 2019 میں احمدیوں پر ہونے والے مظالم کی داستان

2019ء میں سامنے آنے والے چند تکلیف دہ واقعات سے انتخاب

احمدی عبادت گاہ کو درپیش خطرہ

واہ کینٹ 19 ستمبر 2019ء: ایک نامعلوم شخص احمدیہ عبادت گاہ کے مرکزی دروازے پر آیا، دروازے کو زور زور سے ٹانگیں ماریں اور گھاس اور جھاڑیاں اکٹھی کر کے وہاں آگ لگا دی۔ ڈیوٹی پر موجود خدام کی مداخلت پر یہ شخص فرار ہوگیا۔ یہی بندہ اگلی صبح ساڑھے پانچ بجے ہاتھ میں ایک لوہے کا سریا اٹھائے ہوئے دوبارہ آیا۔ اس مرتبہ یہ شخص سیکیورٹی کیمروں کو توڑ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ احمدی خدام نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج کی مدد سے اس کو شناخت کیا جاسکتا ہے۔ اس شخص کے خلاف پولیس اسٹیشن میں درخواست بھی دائر کی گئی۔ اسی جماعت میں دو ماہ قبل بھی کچھ شرپسند افراد نے احمدیہ عبادت گاہ کی سیکیورٹی پوسٹ کو آگ لگا دی تھی جو کہ ڈیوٹی پر موجود خدام نے بجھا دی تھی۔ پولیس نے سی سی ٹی وی فوٹیج کی مدد سے آگ لگانے والے افراد کو گرفتار کرلیا تھا جنہیں بعد میں ان کے خاندان کے ذمہ دار افراد کے معافی مانگنے پر رہا کر دیا گیا تاہم مقامی احمدیوں کی جانب سے SHO کو اس حوالہ سے درخواست کی گئی کہ اس واقعہ کی ایف آئی آر کے اندراج کے ساتھ ساتھ انصاف کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔

احمدی استاد کی مخالفت

ڈیرہ گلاب خیل ضلع خوشاب: مکرم محمد یونس صاحب شاد اکیڈمی کے نام سے ایک نجی تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔ تقریباً 200 طلباء اس ادارے میں زیرِ تعلیم ہیں۔ کچھ روز قبل ایک کالعدم تنظیم سے تعلق رکھنے والے افراد نے حکام کو شکایت کی کہ "یہاں پر قادیانی ایک سکول چلا رہا ہے جہاں بہت سے 'مسلمان' طلباء زیرِ تعلیم ہیں۔ یہاں بچوں کو ہراساں کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کو فوری طور پر بند کیا جائے۔ عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں اگر اس پر حملہ کیا گیا، کوئی بچہ اغواء ▯ ہوگیا یا کوئی استاد یا طالب علم متاثر ہوا تو تمام تر ذمہ داری ایس ایچ او اور سول انتظامیہ پر ہوگی"۔

انتظامیہ نے فوری نوٹس لیتے ہوئے ان کی درخواست کے مطابق کچھ اقدامات کیے۔ انتظامیہ کی اس کمزوری کی وجہ سے ملاؤں کو شہ مل گئی اور وہ جماعت احمدیہ کی مخالفت میں مزید دلیر ہوگئے۔ چنانچہ احمدی اپنی عبادت گاہ میں عیدالاضحیٰ کی نماز بھی ادا نہ کر سکے بلکہ نماز کی ادائیگی کے لیے ایک احمدی کے ڈیرے پر جمع ہونا پڑا۔ مخالف ملاؤں کی اب یہ کوشش ہے کہ احمدیوں کو نماز سنٹر پر نمازِ جمعہ کی ادائیگی سے بھی روک دیا جائے۔ مخالفین شاد اکیڈمی کے خلاف پروپیگنڈا میں مزید شدت لے آئے ہیں۔ اس اکیڈمی کی ایک اچھی شہرت ہے اور جس میں زیرِ تعلیم طلباء کی تعداد اس کی بہتر کارکردگی کی وجہ سے بڑھی ہے۔ مخالفین نے ایک اور درخواست انتظامیہ کو 29 اگست کو دے دی جس میں یہ تحریر تھا کہ اکیڈمی میں طلباء کو احمدیت کی تبلیغ کی جارہی ہے اس لیے اس کی رجسٹریشن منسوخ کر دی جائے۔ انہوں نے اکیڈمی میں تحریر قرآنی آیات اور اسلامی اقوالِ زرّیں پر بھی اعتراض کیا اور سکول انتظامیہ کے خلاف ایف آئی آر درج کروانے کا بھی مطالبہ کیا۔

یہ تمام کارروائی قاری عبدالستار کی درخواست پر کی گئی ہے جو کہ ملک کے ایک سیکیورٹی ادارے کے ہیڈکوارٹر میں سرکاری ملازم ہے اور اس کا بھائی روڈہ تھل میں عبادت گاہ کا امام ہے۔ اس اقدام پر اردگرد کے دیہات میں جماعت احمدیہ کی مخالفت میں مزید شدت آگئی ہے۔

ربوہ میں مخالفینِ احمدیت کی کانفرنس کا انعقاد

7 ستمبر 2019ء: آئین پاکستان کی دوسری ترمیم کی یاد میں پاکستان بھر میں مخالفینِ احمدیت جلسے اور ریلیاں منعقد کرتے ہیں۔ یہ ترمیم 1974 میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں کی گئی تھی جس کے ذریعے سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔ اس ترمیم نے پاکستان میں احمدیوں پر ظلم کے دروازے کھول دیے۔ مولوی حضرات ہر سال جماعت احمدیہ پاکستان کے مرکز ربوہ میں، جہاں 95 فیصد سے زائد آبادی احمدیوں کی ہے، ایک خصوصی کانفرنس کا انعقاد کرتے ہیں۔ اس کانفرنس میں دور دراز سے مولوی ربوہ کے رہائشیوں اور ان کی قابل تکریم ہستیوں کو گالم گلوچ کا نشانہ بنانے آتے ہیں۔ ہر سال جماعت احمدیہ کی طرف سے درخواست کے باوجود حکام اس کانفرنس کو ربوہ میں منعقد کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اس سال بھی جماعت احمدیہ کی انتظامیہ کی طرف سے حکام کو ربوہ میں اس کانفرنس کے انعقاد کی اجازت نہ دینے کی درخواست کی گئی جس میں موقف اختیار کیا گیا کہ اس بات کا شدید خدشہ ہے کہ ریلی سے اس شہر کا امن خطرہ میں پڑ جائے گا۔ خصوصاً جب کہ ملکی صورت حال بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کانفرنس اور اس کے نتیجے میں پیش آمدہ نقصانات اور خطرات سے انتظامیہ کو آگاہ کرتے ہوئے اس جلسے کے ربوہ میں انعقاد کو روکنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن انتظامیہ نے احمدیوں کی طرف سے دی گئی درخواستوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کے انعقاد کی اجازت دے دی۔ اس کانفرنس کے دوران حکومتِ وقت سے جو مطالبات کیے گئے وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

- ☆ قادیانی پاکستان اور اسلام مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور حکومتی اداروں میں اثر ورسوخ حاصل کر رہے ہیں ان کی سرگرمیوں کو روکا جائے اور کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے۔
- ☆ قومی شناختی کارڈ پر مذہب کا خانہ بنایا جائے یا مسلمانوں کے لیے شناختی کارڈ کا رنگ تبدیل کر دیا جائے تا کہ آئینی ضرورت کے تحت مذہبی فرق کو نمایاں کیا جاسکے۔
- ☆ قادیانی ٹی وی چینل ایم ٹی اے شرارت، فساد اور توہین آمیز اسلامی عقائد پھیلا رہا ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ نہ صرف اس چینل کو بلکہ سوشل میڈیا پر قادیانی شرارتوں کو روکے۔
- ☆ فوج کا نعرہ جہاد ہے اور قادیانی جہاد کے منکر ہیں لہذا ان کو فوج میں بھرتی نہ کیا جائے۔
- ☆ اس ملک میں، جو اسلام کے نام پر وجود میں آیا، توہین رسالت کی شرعی سزا کو نافذ کیا جائے۔
- ☆ حکومت کو چاہیے کہ تمام ملک کے تعلیمی نصاب میں ختمِ نبوت کے اسباق کو شامل کرے۔
- ☆ قادیانی املاک کو حکومت فوری قبضہ میں لے۔
- ☆ احمدی مخالف قانون کو بھرپور طریقہ سے لاگو کیا جائے اور قادیانیوں کو مسلمانوں سے مشابہت رکھنے سے روکا جائے۔
- ☆ ستمبر کو ملکی سطح پر یومِ ختم نبوت کے طور پر منایا جائے اور اس روز عام تعطیل کا اعلان کیا جائے۔

احمدی کے کلینک پر حملہ

ٹوبیکی، گوجرانوالہ **4 ستمبر 2019ء**: ایک احمدی جاوید احمد اس گاؤں میں کلینک چلاتے ہیں۔ انہیں اکثر اپنے احمدی ہونے کی وجہ سے دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کچھ روز قبل چند نوجوان ان کے کلینک پر آئے اور ان پر حملہ کیا۔ انہوں نے مقامی تھانے میں اس واقعہ کی رپورٹ بھی درج کروائی۔

پشاور میں جماعت احمدیہ کی مخالفت

ستمبر 2019ء کے دوران پشاور میں ہونے والے چند

واقعات کچھ یوں ہیں:

☆ مطہر احمد صاحب مہمند آباد کے بچے جمال انٹرنیشنل سکول میں زیر تعلیم تھے۔ کسی نے سکول انتظامیہ کو خبر دی کہ یہ بچے احمدی ہیں چنانچہ سکول انتظامیہ نے مطہر احمد کے بچوں کو اپنے ''انٹرنیشنل'' سکول میں آنے سے روک دیا۔

☆ معراج احمد کا تعلق گلبرگ خیبر پشاور سے ہے جو گذشتہ بیس سال سے ایک کامیاب فارمیسی کا کاروبار کر رہے تھے۔ اب کچھ عرصہ سے ختم نبوت تنظیم کے ممبران ان کے لیے مسائل کھڑے کر رہے ہیں اور نہ صرف ان کو بلکہ ان کے سٹاف کو بھی ہراساں کر رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کے سٹاف نے ان کے ساتھ مزید کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

☆ خالد رشید بازید خیل میں ایک کلینک پر کام کرتے ہیں۔ حال ہی میں انہیں ایک نامعلوم نمبر سے ایک فون کال موصول ہوئی نامعلوم شخص نے بانی جماعت احمدیہ کے خلاف نازیبا زبان کا استعمال کیا اور دس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا اور مطالبہ پورا نہ کرنے کی صورت میں قتل کی دھمکی بھی دی۔

☆ ایک احمدی سفیر احمد کو جو کوہاٹی گیٹ پر پلاسٹک کی بوتلوں کے کاروبار سے منسلک ہیں احمدی ہونے کی وجہ سے مالک نے انہیں دکان چھوڑنے کا کہا اور احمدیت کے خلاف سخت اور نازیبا الفاظ استعمال کیے۔

☆ شفیق الرحمٰن جو کہ کوہاٹ روڈ پر واقع انڈسٹریل اسٹیٹ میں پلاسٹک بوتلوں کی فیکٹری چلا رہے ہیں۔ عیدالاضحیٰ سے قبل ان کے ایک ملازم نے بتایا ایک مولوی آپ سے ملنا چاہتا ہے اور آپ کو مسلمان بنانا چاہتا ہے۔ اس کے بعد شفیق الرحمٰن کو جماعت مخالف کچھ پمفلٹس اور اخبارات بھی موصول ہونا شروع ہو گئیں۔

کچھ احمدی اسیران کا تذکرہ

☆ 2014ء میں چار احمدیوں خلیل احمد، غلام احمد، مبشر احمد اور احسان احمد آف بھوئیوال کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ درج کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے دو روز بعد 16 مئی 2014ء کو خلیل احمد کو مدرسے کے ایک طالب نے اس حالت میں شہید کر دیا تھا جبکہ وہ پولیس کی حراست میں تھے۔ بقیہ تینوں احمدی افراد کو 18 مئی 2014ء کو گرفتار کیا گیا۔ ایک سال بعد ان کی فرد جرم میں ہائی کورٹ کے جج کی سفارش پر دفعہ 295C کا اضافہ کر دیا گیا جبکہ سیشن جج نے 11 اکتوبر کو انہیں سزائے موت سنائی۔ اس فیصلے کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی گئی ہے۔ عدالت دو سال تک اس کیس کی شنوائی ہی نہیں کر پائی۔ یہ تینوں احمدی پانچ سال سے زائد عرصہ سے قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا ہیں۔

انسانی حقوق کا عالمی دن

ملتان پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی ملتان ٹاسک فورس نے انسانی حقوق کے عالمی دن کے موقع پر ایک مکالمے کا اہتمام کیا جس میں انسانی حقوق کے ارکین، سماجی و سیاسی جماعتوں کے عہدیدران، وکلاء اور طلباء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

ایچ آر سی پی کے ریجنل کوآرڈینیٹر فیصل محمود نے شرکاء کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آج پوری دنیا میں انسانی حقوق کا عالمی دن منایا جا رہا ہے اس دن کے منانے کا مقصد انسانی حقوق کی پاسداری پر زور دینا ہے۔ پاکستان میں انسانی حقوق کی بڑھتی ہوئی خلاف ورزیاں انسانی حقوق کے کارکنوں کے لئے تشویش کا باعث ہیں۔ ریاست ملک میں انسانی حقوق سے متعلق اقوام متحدہ کی سفارشات کا فوری طور اطلاق کرے۔

عاصمہ خان ایڈووکیٹ نے شرکاء کو انسانی حقوق کے عالمی منشور کے نکات پڑھ کر سنائے۔ ایچ آر سی پی کے کونسل رکن نذیر احمد نے شرکاء سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ 2018 کی نسبت 2019 میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہوا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا حکومتی رویہ اس اہم معاملہ پر غیر سنجیدہ ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر رفیدہ نواز نے کہا کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور میں جو تحفظات شہریوں کو دیئے گئے ہیں اور یہی حقوق ہمارا آئین بھی شہریوں کو دیتا ہے لیکن بدقسمتی سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں طاقت کا قانون سب پر بھاری ہے۔ رائے کی آزادی پر پابندی ہے۔ انسانی حقوق کے کارکن ہونے کی حیثیت سے ہم سب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر گہری نظر رکھیں اور انہیں اجاگر کرتے رہیں۔

نوجوان طبقہ کو انسانی حقوق کے نظام کے حوالے سے آگہی دیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر اپنی آواز بلند کرتے رہیں۔ مزید کہا کہ گذشتہ دنوں طلباء نے اپنے مطالبات کے حق میں جو ریلیاں نکالیں تھیں ان پر دہشت گردی کے تحت ہوتے والے مقدمات کی وہ پرزور مذمت کرتے ہیں۔ ہر شہری کو پرامن احتجاج کرنے کا حق حاصل ہے۔ تقریب کے دیگر شرکاء میں اعجاز حیدر، رانا اقبال، حنیف لال، غلام حیدر، شاہد ندیم، ذیشان فاروق، جودت سید، مریم فاروق، لبنیٰ ندیم ایڈووکیٹ، ثریا ایاز ایڈووکیٹ، زہرہ زیدی، نوشین بلوچ ایڈووکیٹ، کامریڈ یامین، شاہد لودھی، لیاقت چوہان ایڈووکیٹ، سلیم قریشی، خالد محمود، سید طاہر سلطان، محمد علی، مہر اشرف، سہیل جاوید اور محمد اکمل شامل تھے۔

(فیصل تنگوانی)

جبری مزدوری کا نظام اور اس سے جڑے مسائل پر ایک نظر

تعارف

جبری مزدوری استحصال کی بدترین شکلوں میں سے ایک ہے۔اس سے غریب مزدوروں کی ایسی ملازمت مراد ہے جس میں اُنہیں برائے نام اُجرت ملتی ہے یا اجرت طے ہی نہیں کی جاتی اور اپنی بقا کے لیے آجروں پر منحصر ہونے کی بدولت' مزدور اور ان کے خاندان نہ صرف جائز اجرت بلکہ نقل وحرکت کی آزادی اور روزگار کے لیے دیگر ذرائع کے انتخاب سے محروم ہوجاتے ہیں۔ یہ ایک ظالمانہ نظام ہے جس کی ہر متاثر فرد کو بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔اِس نظام میں مزدوروں سے غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ان کے خاندانوں کے ہر فرد، بالخصوص بچوں کی زندگی کی قدر گھٹ جاتی ہے، آجر قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ملکی معیشت کمزور ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں گروی مزدوری اور جبری مزدوری کو ختم کرنے کے لیے کئی کوششیں ہو چکی ہیں اور ریاست ایسے ہر رواج کے خاتمے پر کمربستہ ہے لیکن اس کے باوجود اس مسئلہ کی شدت اور پھیلاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔اس کی ذمہ داری کسی حد تک گروی مزدوری کے خاتمے کے 1992 کے قانون میں 2016 میں کی جانے والی ترمیم پر ڈالی جاسکتی ہے جس کے ذریعے 'پیشگی' کے نظام کو بحال کر دیا گیا ہے اور جو پیشگی رقوم کی عدم ادائیگی کی ضرورت میں عملاً مزدوروں کی غلاموں جیسی حیثیت، اُن کی فروخت اور سمگلنگ کو جواز مہیا کرتی ہے۔

قانون کے مطابق مزدوروں کے حقوق

پاکستان کے آئین کے حصہ دوم: ''بنیادی حقوق اور پالیسی کے اصولوں''1 میں مزدوروں کے حقوق سے متعلق کئی دفعات شامل ہیں

☆ آئین کی دفعہ 11 میں غلامی کی تمام صورتوں، جبری مزدوری اور بچوں سے کام لینے کی ممانعت ہے۔

☆ دفعہ 17 انجمن سازی اور انجمنوں میں شمولیت کو ایک بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔

☆ دفعہ 18 تمام شہریوں کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ کوئی بھی قانونی طور پر جائز پیشہ اختیار کریں اور کوئی بھی ایسا کاروبار کرسکیں جس کی قانون میں اجازت ہے۔

☆ دفعہ 25 کے مطابق قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں اور محض صنف کی بنیاد پر اُن میں تفریق کی ممانعت ہے۔

☆ دفعہ 37 (ھ) میں کام کے منصفانہ اور سازگار حالات کار کے تحفظ کا حق دیا گیا ہے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ عورتوں اور بچوں سے کوئی ایسا کام نہیں لیا جائے گا جو اُن کی عمر اور جنس کے لحاظ سے غیر موضوع ہو۔ نیز ملازمت کے دوران ماں بننے والی خواتین کے حقوق متعین کیے گئے ہیں۔

تاہم' قانون بنانے اور اس کے مؤثر نفاذ کا نظام قائم کیے بغیر جبری مزدوری کے خلاف آئینی ضمانتیں عملی صورت اختیار نہیں کرسکتیں۔ جبری مزدوری نظام (خاتمہ) ایکٹ کی منظوری اس سلسلے میں پہلا قدم تھا۔

جبری مزدوری (خاتمہ) ایکٹ

جبری مزدوری کے نظام کے خاتمے کا قانون 1992 میں پارلیمان سے منظور ہوا اور اُسی سال 17 مارچ کو نافذ العمل ہوا۔ اُس دن پاکستان بھر میں جبری مزدوری کا نظام قانونی طور پر ختم ہوگیا، تمام گروی مزدور جبری مزدوری کے ذمہ داری سے آزاد اور سبکدوش ہوگئے ﴿دیکھیے قانون کی دفعہ 4(1)﴾۔

☆ ہر شخص کو جبری مزدوری کے نظام کے تحت پیشگی ادائیگی کرنے یا کسی فرد کو جبری مزدوری یا جبری مزدوری کی کوئی اور صورت اختیار کرنے پر مجبور کرنے سے منع کر دیا گیا ﴿دفعہ 4(2)﴾۔

☆ تمام رسوم و رواج، روایتی طریقے، اور تمام معاہدے یا دیگر دستاویزات، جب بھی بھی طے پائے ہوں، جن کے تحت کسی شخص یا اُس کے خاندان کے کسی فرد پر جبری مزدوری لازمی قرار دی گئی تھی' باطل اور غیر موثر ہوگئے۔(دفعہ 5)

☆ ہر گروی مزدور کے ذمہ واجب الادا قرض واپس کرنے کا فریضہ غیر موثر ہوگیا ﴿دفعہ 6(1)

☆ کسی عدالت، ٹریبونل یا دیگر ادارے کو اختیار نہ رہا کہ وہ جبری مزدوری کے ضمن میں دیے گئے کسی قرض کی وصولی کے لیے کوئی مقدمہ سنیں یا دیگر کارروائی کریں (دفعہ 6 (2)) اور اس قانون کے نفاذ سے پہلے جاری کیے گئے تمام فرامین اور احکامات جن پر عمل درآمد مکمل نہیں ہوا تھا ان کے بارے میں فرض کر لیا گیا کہ اُن پر عمل درآمد ہو چکا ہے۔(دفعہ 6 (3))

☆ گروی مزدوروں سے جبراً وصول کی گئی، فروخت کی گئی، یا رہن کی گئی یا ضبط کی گئی جائیداد اُن کو واپس دلانے کے لیے کئی اقدامات عمل میں لائے گئے۔ (دفعہ 6 (4) تا (7))

☆ جبری مزدوری کے نظام کے تحت کسی بھی حیلے یا بہانے سے کسی کو کام پر مجبور کرنے والا یا کام لینے والا ہر شخص دو سے پانچ سال تک قید یا 50,000 روپے کے جرمانے یا بیک وقت دونوں سزاؤں کا سزاوار ہوسکتا ہے۔ 0 9 دن کے اندر اندر گروی مزدوروں سے چھینی گئی جائیداد واپس نہ کرنے پر قید یا اور جرمانہ کی سزا تجویز کی گئی۔

☆ صوبائی حکومتیں ضلعی حکومتوں کو قانون کے نفاذ کے لیے ضروری تما اختیارات اور فرائض تفویض کرسکتی ہیں۔

☆ منتخب نمائندوں اور عہدے داروں کو جبری مزدوری سے آزاد کیے گئے مزدوروں کی بہبود کے فروغ اور اُن کے معاشی مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری دی گئی تاکہ انہیں دوبارہ گروی قرضے نہ لینے پڑیں۔

☆ ضلعی حکومتوں اور دیگر متعلقہ عہدے داروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس بات کا پتہ چلائیں کہ آیا اُن کے زیرِ انتظام علاقوں میں گروی مزدوری کروائی جا رہی ہے۔گروی مزدوری کے نظام کی کوئی شہادت ملنے کی صورت میں اُن کا فرض تھا کہ اس قانون پر عمل درآمد کے لیے ضروری کارروائی کریں۔

جبری مزدوری کے انسداد کے قانون سے متعلقہ مسائل

جبری مزدوری نظام (خاتمہ) ایکٹ، جسے حکومتِ پنجاب نے معمولی ترامیم کے ساتھ 2012 میں اپنا لیا تھا تمام دیگر قوانین پر مقدم تھا لیکن جنوری 2016 کے صوبائی آرڈیننس نے 'پیشگی' کے نظام کو بحال کر دیا۔اس کی 'حد' وقت پر مبنی اجرت کی صورت میں ایک وقت کے معاوضے کا چھ گنا اور فی نگ ادائیگی کی صورت میں مہینے بھر کی کمائی کا چھ گنا مقرر کیا گیا۔اس اصول کی تاویل میں ابہام سے پیدا ہونے والی دِقت کو ختم کرنے کے لیے اب پیشگی کی حد 50,000 روپے مقرر کی گئی ہے۔ یہ رقم ''موزوں صورتوں میں''، عدالت عظمیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی حد سے کہیں زیادہ ہے

اورمقروض شخص کوغلامی کے بندھن میں دھکیل سکتی ہے۔

جناب آئی۔ اے۔ رحمٰن کے مطابق نہ صرف یہ کہ اِس رجعت پذیر دفعہ کو جبری مزدوری نظام (خاتمہ) ایکٹ میں عائد پیشگی کی ممانعت کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بظاہر ناممکن ہے بلکہ ''قانون سازوں نے 1988 سے پہلے 1992 تک جاری رہنے والی اس تمام تر بحث کونظرانداز کر دیا ہے کہ پیشگی رقم کو کس طرح عشروں تک ہیرا پھیری کے ذریعے مزدوروں کے ذمہ واجبات میں اضافے، اُن کی غلاموں جیسی حیثیت اور پیشگی کی ادائیگی میں ناکامی پر اُن کی فروخت کو جائز قرار دینے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔''

پیشگی کے نظام کی بحالی سے مزدوروں کے استحصال اور قرض کی غلامی کے مسائل ایک بار پھر سامنے آ گئے ہیں۔ ایچ آر سی پی (HRCP) نے پاکستان بھر میں محنت کشوں کے ساتھ جن 13 فوکس گروپ مباحثوں کا انعقاد کیا تھا اُن سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ آجروں کی طرف سے دی گئی پیشگی اُنہیں اپنی طاقتور حیثیت اور سیاستدانوں اور پولیس کے ساتھ سماجی تعلقات سے ناروا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزدوروں کو پابند رکھنے اور اُن پر بے پناہ دباؤ ڈالنے کا موقع دیتی ہے۔ اسی سے متعلق ایک اور مسئلہ حساب داری میں فریب دہی کا ہے جسے قرض کی ادائیگی کا انتظام کرنے والے لوگ محنت کشوں کے ذمہ رقم کو بڑھانے اور یوں اورانہیں دیر تک پابند رکھنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

جنوری 2016 کے آرڈیننس کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ قانون پر عملدرآمد کا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت نگران ضلعی کمیٹیاں تو بنا دی گئی ہیں لیکن مالکان اور آجروں کی نگرانی اپنی پست ترین سطح پر ہے اور بچوں سے کام لینے، مزدوروں کو تاخیر سے یا کم اجرت دینے اور کام کے برے حالات کار جیسے رواج کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

منصوبے کا مقصد

یہ منصوبہ ایچ آر سی پی اور فریڈرک نعمان فاؤنڈیشن فار فریڈم کے درمیان تعاون پر مبنی ایک کوشش ہے۔ اس کا مقصد ایسی سفارشات کو قلمبند کرنا ہے جن سے جبری مزدوری اور انسانوں کی اسمگلنگ کے خاتمہ میں مدد ملے اور اندرون ملک محنت کشوں کے حالات بہتر ہوسکیں۔ اس کا ایک اہم پہلو ان معاملات سے متعلق رائج قوانین کا جائزہ لینا اور یہ اندازہ لگانا ہے کہ آیا اُن پر مؤثر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

طریق کار

مزدوروں کے حقوق کی موجودہ صورتِ حال کو جانچنے کے لیے ملک بھر میں سات جگہوں پر متعلقہ فریقین سے مشاورت اور 13 جگہوں پر مزدوروں کے ساتھ فوکس گروپ مباحثے منعقد کیے گئے۔

متعلقہ فریقین کے ساتھ مکالمے کا مقصد ان قوانین کی نوعیت اور دائرہ کار سے متعلق شرکاء کے فہم میں بہتری لانا تھا جو غلامی کی جدید صورتوں سے متعلق ہیں جن میں جبری مزدوری، گھریلو مشقت، بچوں سے کام لینا، انسانی اسمگلنگ اور زبردستی کی شادیاں شامل ہیں۔ پاکستان میں جبری مزدوری کی موجودہ صورتِ حال اور اُن مسائل پر بحث کروائی گئی جن سے متعلقہ محکموں کے کام میں رکاوٹ پیش آتی ہے اور اس سے سفارشات اخذ کی گئیں۔ متعلقہ فریقین کے ساتھ کی گئی مشاورتی تقاریب میں متعلقہ سرکاری محکموں کے ارکان، بالخصوص بین الاقوامی معاہدات پر عملدرآمد کے شعبے کے افراد بھی موجود تھے اور نگران ضلعی کمیٹیوں کے ارکان، وکلاء، انسانی حقوق کے کارکن، صحافی اور سماجی بہبود کے افسران بھی۔

فوکس گروپ مباحثے ہر صوبے میں مختلف اضلاع میں رکھے گئے تھے۔ ان کا مقصد مزدوروں سے بات چیت کرنا اور اُن کے موجودہ مسائل کو سمجھنا تھا۔ یہ مباحثے گلگت، حیدر آباد، میر پور خاص، کوئٹہ، تھر، اوکاڑہ، پشاور، درہ آدم خیل، کوہاٹ، کراچی، ملتان، فیصل آباد، چنیوٹ، لاہور اور میں سکھر میں ہوئے۔ ایچ آر سی پی کی ٹیم نے ہر علاقے میں ہر قسم کے مزدوروں کے مسائل کا احاطہ کرنے کے لیے اُن سے غیر رسمی اور غیر ساختہ انٹرویو بھی کیے۔

موضوع وار بیان

محکمہ محنت کے مسائل: نگرانی، عمل درآمد اور دستاویز سازی کا فقدان

مؤثر انضباطی نظام کی عدم موجودگی، نیز افرادی قوت کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کے لیے طویل المدت منصوبہ بندی میں ناکامی کے نتیجے میں مزدوروں کے استحصال میں اضافہ ہوا ہے۔ قانون کی تعمیل میں ایک رکاوٹ خواندگی کی پست سطح بھی ہے کیونکہ مزدور عام طور پر اپنے حقوق سے لاعلم اور غیر آگاہ ہونے کے باعث قانون کی خلاف ورزیوں، عدم تعمیل اور کام کی جگہ پر کم اجرتوں کی شکایت نہیں کر پاتے۔ اس کے ساتھ محکمہ محنت بھی ایسے معائنے کا اہتمام نہیں کرتا جس سے یہ پتہ چلے کہ سماجی تحفظ کے انتظامات مہیا کیے گئے ہیں یا نہیں، مؤثر طور پر روح بہ عمل ہیں یا نہیں اور بچوں سے کام لینے جیسے غلط رواج جاری ہیں یا نہیں۔

ملازمتوں کے معاہدوں کا نہ ہوں

شرکا سے یہ سوال کیا گیا تو اُن کا کہنا تھا کہ بھرتی کے وقت اُنہیں رسمی، تحریری معاہدے نہیں دیے جاتے۔ وقار کا، جو گلگت بلتستان میں چیری چننے والوں میں سے ہیں، کہنا تھا کہ: 'زیادہ تر مزدور زبانی معاہدوں کی صورت میں بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اِس علاقے میں کام کرنے والے دوسرے مزدوروں کی طرح ہماری بھرتی بھی زبانی اقرار سے ہوئی تھی۔ تحریری معاہدوں کا اصول صرف صرف سرکاری محکموں کی حد تک لاگو ہے۔ نجی اداروں میں آپ کو تحریری معاہدے کے ساتھ بھرتی نہیں کیا جاتا۔ خاص طور پر جب آپ کا کام موسمی نوعیت کا ہو۔'

اینٹوں کے بھٹوں پر ملازمت کے معاہدے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ منتظمین ہی پیشگی کا حساب رکھتے ہیں اور کسی مزدور کو اس کی تفصیلات کا پوچھنے کا حق حاصل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پیشگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ہم نسل در نسل انہی حالات میں کام کرنے پر مجبور رہتے ہیں کیونکہ ہم کبھی بھی اپنے قرضے ادا نہیں کر پاتے۔'' چنیوٹ کے ایک بھٹہ مزدور نے بتایا۔ ایک ایف جی ڈی میں شریک کوئلہ نکالنے والے ایک مزدور کے مطابق اُن کے اور اُن کے آجروں کے درمیان کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں ہوتا کیونکہ ملازمت کی توثیق زبانی اقرار سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ کمپنی مالکان کسی بھی وقت کسی بھی وجہ سے مزدوروں کو فارغ کر سکتے ہیں۔ بالعموم اس اقرار میں رہائش کسی حادثے کی صورت میں علاج اور کان کنی کے لیے ضروری آلات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ خوراک کا خرچ مزدور خود اٹھاتے ہیں۔ ایک کان کن رحیم خان کا کہنا تھا کہ ''کام سے نکالے جانے کی بڑی وجوہات چوری اور کاہلی ہوتی ہے۔ کسی مزدور کی وفات کی صورت میں اُس کے خاندان کو کوئی مالی معاوضہ نہیں ملتا۔ حکومت اور مالکان نے کسی کان کن کی موت کی صورت میں 500,000 روپے اور 300,000 روپے کے پیکیج کی منظوری تو دے رکھی ہے لیکن آج تک کسی کو اس کی ادائیگی نہیں ہوئی۔''

فیصل آباد کے ایک مزدور نے جو اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والوں کی یونین کے جنرل سیکرٹری ہیں، بتایا کہ وہ کسی ناانصافی کی صورت میں مالکان یا منتظمین کے خلاف عدالت میں نہیں جا سکتے کیونکہ اُن کے پاس ملازمت کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ اصل میں ایک زیادہ بڑے مسئلے سے جڑا ہوا ہے جس سے جدید غلامی کی نشاندہی ہوتی ہے: تمام مزدوروں کو قومی شناختی کارڈ اور سماجی تحفظ کے کارڈ فراہم کرنے میں ناکامی۔ (اس پر تفصیلی بحث اگلے حصے میں آئے گی)۔

بچوں سے کام لینا اور جنسی استحصال

یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان میں 1999 کے بچوں

سے مزدوری لینے کی بدترین صورتوں سے متعلق بین الاقوامی معاہدے کی تعمیل کی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔ اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ خطرناک حالات میں بچوں سے کام کرانے کا گھناؤنا رواج بلا روک ٹوک جاری ہے۔ بعض اوقات پیشگی مزدوروں کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر بوجھ بن جاتی ہے۔ ایسے میں اس قرض کی ادائیگی کے لیے والدین اپنے بچوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ یہ رقم کما کر قرض ادا کرسکیں۔ چنیوٹ کے ایک بھٹہ مزدور بوٹا کے مطابق ''والدین مشکل حالات سے مجبور ہوکر خود ہی اُنہیں بھٹوں کے مالکان کے پاس بھیج دیتے ہیں جہاں وہ اُن کے ہاتھوں بے بس مہرے بن جاتے ہیں۔'' کھیتوں پر مزدوری کے لیے دستیاب بچوں کی تعداد میں اضافے سے زراعت سے جُڑے معاشرے میں پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ دس سال اور بارہ سال کی عمر کے بچے اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرتے ہیں۔ چنیوٹ میں وہ عمارتیں اور سڑکیں بنانے کی مزدوری میں بھی نظر آتے ہیں۔ ایک مشاورت میں شرکا نے بتایا کہ بھٹہ مالکان مزدوروں کے بچوں کو اسکول نہیں جانے دیتے کیونکہ وہ اُن کے لیے سستی مزدوری کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ''اگر مفت دوائیں، رہائش اور مفت تعلیم مہیا ہوں تو بہت سے مدرسوں کو چھوڑ کر اسکولوں میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی خاندان کے دو یا تین افراد کے کام کرنے کی صورت میں ان کے پاس کافی پیسہ جمع ہو جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے کام کرتے رہیں۔ چار مزدوروں نے پیشگی چکانے کے لیے اپنے گردے بیچ دیے۔ گردوں کی فروخت کا انتظام بھی بھٹے کے مالکان نے کیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ والدین خود غربت کے لامتناہی دائرے کے ہاتھوں اس نظام کا شکار اور مظلوم ہیں۔''

''گھروں اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں اور بچوں کے کوائف کے قلمبند نہ ہونے سے اُن کے معاشی اور جنسی استحصال کا موقع پیدا ہوتا ہے۔ استحصال کے خاتمے کے لیے متعلقہ محکموں کو چاہیے کہ ہر مزدور کے کوائف تحریر میں لانے کو یقینی بنائیں۔ اس ماحول میں نہ ہم عورتیں تعلیم حاصل کرسکتی ہیں اور نہ ہی ہمارے بچے''۔ گفتگو میں شریک اور خاتون نے کہا۔

وکیل اور تربیت کار ذوالفقار قریشی نے اس امر کی نشاندہی کی کہ بچوں سے مشقت لینے کے کئی واقعات کی خبر مقامی ذرائع ابلاغ کی بجائے بین الاقوامی ذرائع سے آتی ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ معاملے کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مقامی اور قومی سطح پر اسے اچھی طرح اجاگر کیا جاتا رہے۔

ایچ آر سی پی کی تربیت کار محترمہ طاہرہ حبیب کے مطابق ''بعض اوقات مزدور اس پیشگی کی وجہ سے کام نہیں چھوڑ سکتے جو انہوں نے مالک یا ٹھیکیدار سے لی ہوئی ہوتی ہے۔'' ان حالات میں لاہور میں ایک بھٹہ پر کام کرنے والے طلعت کے مطابق ''والدین اور اُن کے بچوں کو اپنی ساری زندگی محکومی میں گزارنا پڑتی ہے کیونکہ یہ بچے پیدا ہی اُن کے والدین کے یہاں ہوئے جو غلامی میں پھنسے ہوئے تھے۔'' گویا والدین خود مفلسی کے گھناؤنے چکر کا شکار ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ بچوں کے کام کرنے کے حق میں ہیں اگر اُن کا کام خطرناک نہ ہو مثلاً فٹ بال کی سلائی۔ تاہم کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا تھا کہ 10 سالہ زینب کے انجام سے (جو اپنے کزن کے ساتھ دودھ خریدنے گئی تھی اور جس کی لاش دس دن بعد ملی) لگتا ہے کہ بچے آسانی سے جرائم پیشہ عناصر کا شکار ہو سکتے ہیں اور اُنہیں ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اُنہیں تحفظ حاصل ہو۔ چنیوٹ میں اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے سعید کا کہنا تھا کہ ''فٹ بال کی سلائی، چائے کے سٹال پر کام کرنا یا کسی ورکشاپ میں سادہ کام کرنا خطرناک مزدوری کے ذمرے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ان کاموں کو فروغ دینا چاہیے اور اس سلسلے میں مزدور بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔''

دوسری طرف خیبر پختونخوا میں ایک فوکس گروپ مباحثے میں شریک غفور خان کا کہنا تھا کہ ''قانون کے مطابق کانوں میں بچوں سے کام لینے کی سخت ممانعت ہے اور ملازمت قومی شناختی کارڈ کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ چنانچہ بچے کانوں کے باہر برتن دھونے، کھانا پکانے اور جنریٹر چلانے جیسے معمول کے کام تو کرسکتے ہیں لیکن اُنہیں کانوں میں داخل ہونے نہیں دیا جاتا۔''

گلگت بلتستان میں شرکا سے پوچھا گیا کہ چیری چننے والے مزدوروں میں بچے بھی شامل ہوتے ہیں یا نہیں تو اُن میں سے ایک افتخار نے جواب دیا کہ ''ہاں۔ بچے بھی مزدوری کرتے ہیں۔ اُن کی عمریں سات سے پندرہ سال تک ہوتی ہیں۔ گلگت بلتستان میں کچھ بچے ورکشاپس اور شاپنگ سٹورز میں خاصے سخت کام بھی کرتے ہیں۔ وہ 10 سے 12 گھنٹے تک کام کرتے ہیں اور اُنہیں اس کا بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔ اُن کے والدین بہت غریب ہوتے ہیں اور اسی لیے اُنہیں کام پر بھیجتے ہیں۔''

یونس نامی ایک مزدور نے بتایا کہ ''مزدوری کرنے والے بچوں میں بالغ مردوں یا عورتوں جیسی جسمانی طاقت نہیں ہوتی جیسا کہ خطرناک کام کرنے والے بچوں کو پہنچنے والے جسمانی نقصان کی کئی مثالوں سے ظاہر ہے مثلاً قالین بننے والے کئی بچوں کو دمہ ہو جاتا ہے۔ حاصل بحث یہ ہے کہ بچوں کی مزدوری غلامی کی بدترین شکل ہے۔''

آنکھوں میں آنسو لیے بھٹوں پر کام کرنے والی ایک ماں نے کہا ''اپنے بچوں کو اپنے ساتھ کام کے لیے کہنا ہمارے لیے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ میں خود بیمار ہوں اور میرا خاوند اکیلے روزانہ 1500 اینٹیں نہیں بنا سکتا چنانچہ میری بیٹیاں باپ کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں تاکہ روزانہ اس ہدف کو حاصل کرسکیں۔

حکومتی نگرانی اور معائنے کا فقدان

سماجی انصاف اور عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی فوزیہ وقار نے کہا کہ ''کام کے حالات اور شرائط کی نگرانی کے لیے محکمہ محنت کی طرف سے معائنہ بنیادی چیز ہے۔ اس انتظام کو ختم کرنے کی بجائے زیادہ مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔'' حکومت کی طرف سے معائنے سے صرف نظر مزدوروں کے استحصال کا باعث بننے والے ہر غیر قانونی رواج کے جاری رہنے کا اولین سبب ہے۔

گلگت میں چیری چننے والے ایک مزدور نے کہا ''گلگت بلتستان میں جہاں ہم نوکری کرتے ہیں کبھی کسی سرکاری محکمے کا کوئی کارندہ نہیں آیا۔ ہمارے خیال میں گلگت میں ایسے کسی ادارے کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی محکمہ موجود ہے تو وہ غیر فعال ہے۔ چنیوٹ میں ایک مزدور رحیم نے کہا ''یہ ملک اسلامی کہلاتا ہے لیکن یہاں جہنم سے بدتر ظلم ہوتے ہیں۔ کارخانوں کے مالک محکمہ محنت کو معائنہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ اس مقصد کے لیے معائنہ کاروں کو رشوت دیتے ہیں تاکہ وہ اُن کے کارخانوں کا معائنہ نہ کریں۔ یہ بات کس طرح معلوم کی جاسکتی ہے کہ مزدوروں کے پاس سماجی بہبود کے کارڈ ہیں بھی یا نہیں اور اُن کا فائدہ کیا ہے؟''۔

بھٹہ مزدور بشیر نے کہا ''جس دن کسی بھٹہ کا معائنہ ہونا ہو بھٹے والوں کو پہلے سے اندرون خانہ اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ اُس دن بچوں کو بھٹہ سے دور رکھا جاتا ہے۔ ایک اور مزدور عارف نے اس پر اضافہ کیا کہ ''بعض اوقات بچوں کو بھٹے کے مالک کے دفتر میں کمروں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ عین اُس جگہ پر جس کا فرضی طور پر معائنہ ہو رہا ہے۔''

کم از کم اجرت کے معیار پر عمل درآمد کا فقدان

خطرے سے دوچار گروہوں کے حقوق سے متعلق رائج قوانین قانون سازی کے ڈھانچے اور اداروں پر

انضباطی اختیار کے فقدان کے باعث غیر مؤثر ہو رہے ہیں۔ اب قرضے کی قانونی اجازت ہونے کے باعث پیشگی پھر سے ایک بار بار پیش آنے والا مسئلہ بن گئی ہے۔ پاکستان میں کم از کم یومیہ اجرت کا معیار 1200 روپیہ ہے۔ تاہم اکثر عورتوں کو خود اپنی اجرت تک رسائی حاصل نہیں ہے کیونکہ اُن کے خاندانوں کے مرد مزدور براہ راست ٹھیکیدار سے اُن کی اُجرت وصول کر لیتے ہیں: یہ بات مشاورت میں شریک ایک عورت نے بہت تکلیف دہ انداز میں بتائی۔ پیشگی یا قرض کے نام پر مزدوروں کا استحصال جاری ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے مزدوروں کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے بھٹہ مالکان سے بچے کی پیدائش، خاندان کے کسی فرد کی بیماری یا کسی شادی کے موقع پر کتنی رقم قرض لے رکھی ہے۔ یہ قرض بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ کام کی کوئی بھی مقدار اس کی ادائیگی کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

ایک بھٹہ مزدور عرفان کا کہنا تھا کہ ''کم از کم اجرت 1200 روپے ہے لیکن ہمیں کبھی 600 روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ بھٹہ کا مالک کہتا ہے میں تمہیں اس سے زیادہ پیسے نہیں دوں گا کیونکہ تم مجھ سے پیشگی رقم لے چکے ہو۔''

لاہور میں ایچ آر سی پی کے زیر اہتمام ایک مشاورت میں مزدوروں کی حالتِ زار کو نمایاں کرتے ہوئے ایک وکیل نے کہا ''استحصال کا دائرہ مناسب اجرت کی عدم ادائیگی سے وسیع تر ہے۔ چنانچہ نگرانی کی ضلعی کمیٹیوں کے رکن شہریوں کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ جبری مزدوری ایکٹ کے تحت ممنوع کوئی بھی رواج عمل میں نہ آئے۔ اس سلسلے میں جو بھی کمی بیشی اُن کے علم میں آئے اُنہیں اس کی خبر دینی چاہیے۔'' ایسی مشاورت میں شریک خالد محمود کا تبصرہ تھا کہ ''اِس سال اپنی مدت کے آغاز کے بعد سے پنجاب کی صوبائی کمیٹی کا صرف ایک اجلاس ہوا ہے۔ بی ایل ایف کے مہر صفدر نے محکمہ محنت کی معائنہ ٹیم کے ذریعے نگرانی اور جانچ کا ایک باقاعدہ نظام قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا اور نگرانی کی ضلعی کمیٹیوں کے ارکان سے درخواست کی کہ وہ اس مقصد کے لیے زیادہ پیش عملی سے کام لیں۔

مزید برآں گلگت بلتستان میں ایچ آر سی پی ٹیم سے ایک گفتگو کے دوران جب مزدوروں سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اپنے حالات کار سے مطمئن ہیں تو اُن کا جواب تھا کہ ''نہیں۔'' ''ہم اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہمارے معاوضے میں اضافہ ہونا چاہیے اور کام کے اوقات میں کمی ہونی چاہیے۔ ریاست کی جانب سے بھی ہماری زندگیوں کو بہتر بنانے کی کچھ نہ کچھ کوشش ہونی چاہیے تاکہ ہم اپنی کمائی سے اپنے اخراجات پورے کر سکیں اور عزت کی زندگی جی سکیں۔'' ایک مزدور سلمان نے جواب دیا کہ ''اس کا انحصار ہمارے کام کی نوعیت پر ہے۔ مثلاً سبزی کے کھیتوں پر کام کرنے کی صورت میں ہماری کمائی اس نسبت سے ہوتی ہے کہ ہم نے کتنے کلوگرام سبزیاں چُنی ہیں چنانچہ ہم زیادہ سے زیادہ گھنٹے کام میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام طور پر ہم دو شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ پہلی دفعہ صبح سویرے اور دوسری دفعہ شام تک۔ ہم دن بھر میں کم از کم آٹھ گھنٹے کھیت میں کام کرتے ہیں۔''

محکمہ محنت کی نااہلی سے پیدا ہونے والی دقتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کوئلے کے کان کن افسر خان نے کہا ''کوئے کے کان کنوں کے کوئی باقاعدہ تنخواہ کے پیکیج نہیں ہیں۔ وہ عارضی معاہدے کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ ہر کان کن کو فی ٹن 5,000 روپے ملتے ہیں۔ نتیجتاً ہر کان کن 30,0000 سے 35,000 روپے مہینہ تک کماتا ہے۔ 70,000 یا 100,000 روپے کمانے کی مثالیں بہت شاذ و نادر ملتی ہیں۔ دوسری طرف مالکان لاکھوں روپے کماتے ہیں لیکن کان کنوں کے تحفظ کے لیے ضروری آلات اور لازمی سہولتیں تک مہیا نہیں کرتے۔ گفتگو میں شریک ایک اور شخص حامد خان نے اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ ''خیبر پختونخوا کے مقابلے میں بلوچستان کے کان کنوں کو زیادہ سہولتیں میسر ہیں۔ مثلاً ان کی اپنی انجمن ہے اور انہیں ضرورت پڑنے پر پیشگی ادائیگی مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے بچوں کو تعلیمی وضائف بھی ملتے ہیں۔''

سماجی تحفظ کے کارڈ نہ ہونا

آج تک' مزدوروں کے پاس شناختی کارڈ اور سماجی تحفظ کے کارڈ نہیں ہیں۔ سماجی تحفظ کے کارڈ بنوانا بھٹوں اور کارخانوں کے مالکان کی ذمہ داری ہے لیکن اس قانون پر عمل درآمد کی نگرانی ریاست کا کام ہے۔ عدالتِ عظمیٰ کے وکیل اور ایچ آر سی پی کے تربیت کار اسد جمال کا کہنا تھا کہ 1935 کے قانون کے مطابق اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ہر صنعتی مزدور کو سماجی تحفظ کے کارڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے حقوق کے بارے میں دوسرے مزدوروں سے بھی کم آگاہی کی وجہ سے افغانستان سے آنے والے مزدور جبری مزدوری کا زیادہ نشانہ بن سکتے ہیں۔ ملتان میں ایچ آر سی پی کے زیر اہتمام ایک مشاورت میں ایک تحقیق کار اور سماجی کارکن نے یہ تبصرہ کیا۔ ''آئین کی دفعہ 125 کے مطابق تعلیم بچوں کے لیے لازمی ہے۔ چنانچہ ریاست کا فرض ہے کہ ایسی تمام سہولتیں فراہم کرے جو اس امر کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہیں کہ تمام بچے اسکول جائیں۔ دوسرے درجے میں یہ ذمہ داری اُن کے والدین اور اُن کے بعد بھٹوں کے مالکان پر عائد ہوتی ہے۔ سماجی تحفظ کے کارڈ نہ ہونے کے سبب بچوں کو وہ تعلیمی وظیفے نہیں مل سکتے جن کے وہ بصورت دیگر حقدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پرچی کا نظام جس کے تحت کوئی بھٹہ مالک کسی مزدور کو کسی دوسرے مالک کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھیج دیتا ہے کہ پیشگی ادائیگی کے باعث کوئی مخصوص رقم اس کے ذمہ ہے' درحقیقت ایک گروی مزدور کو ہیرا پھیری سے فروخت کرنا ہے۔ اس رواج پر اب تک عمل ہو رہا ہے۔

فیصل آباد میں ایک فوکس گروپ مباحثے میں شریک یوسف کا کہنا تھا کہ یہ معلوم کرنا کہ کسی بھٹہ مزدور کے پاس سماجی تحفظ کا کارڈ ہے یا نہیں بھٹہ کے مالکان کی ذمہ داری ہے۔ اگرچہ یہ کارڈ استحصال کے انسداد کا مؤثر ذریعہ نہیں ہو سکتے۔'' کسی جبری مزدور کے بیروزگار ہونے پر سماجی تحفظ کے نہ ہونے کا نقصان مزید بڑھ جاتا ہے۔ ''جب ہم بے روزگار ہو جاتے ہیں تو اپنے اخراجات برداشت کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں ہمیں کھانا بھی دکانداروں سے ادھار لینا پڑتا ہے۔

بی ایل ایل ایف کی مجلسِ عاملہ کے رکن مہر صفدر نے اس بات کی نشاندہی کی کہ مذہب کی بنیاد پر تفریق عام ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ''پاکستان میں اینٹوں کے 25,000 بھٹے ہیں۔ ان میں سے 15,000 پنجاب میں ہیں۔ جبری مزدوری کے شکار لوگوں میں سے 80 سے 60 فیصد کا تعلق اقلیتی برادریوں سے ہے۔ اُن سے نہ صرف اس لیے بُرا سلوک کیا جاتا ہے کہ وہ غریب ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اُن کا تعلق اقلیت سے ہے۔'' انہوں نے سماجی تحفظ کے کارڈ نہ ہونے کو اُن بڑے بڑے مسائل میں شمار کیا جن کی وجہ سے مزدوروں کا استحصال جاری رہتا ہے اور اُن کے خلاف تفریق بڑھتی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ریاست تمام مزدوروں کو کم از کم اجرتوں کی ادائیگی اور سماجی تحفظ کے کارڈ کے اجراء کو یقینی بنا دے تو اُن کے پاس ہسپتال کے بل، شادیوں اور جنازوں جیسے اخراجات کی گنجائش موجود رہے گی۔ اس کے نتیجے میں ملازمین کو دیے جانے والے قرضے کم ہو جائیں گے اور یوں پیشگی کا لین دین بھی بلا دِقت چلنے لگے گا۔ ملتان میں ایک فوکس گروپ مباحثے کی میزبانی کرتے ہوئے ایچ آر سی پی کی محترمہ طاہرہ حبیب نے اس امر کی نشاندہی بھی کی کہ قومی شناختی کارڈ کو مزدوری کے لیے لازمی شرط ٹھہرانے کو یقینی بنا کر بچوں سے مشقت لینے کے رواج پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ خود مزدوروں کا ناخواندہ ہونا ایک اور مسئلہ تھا جسے روشنی میں لایا گیا۔ ان میں سے کچھ کا کہنا تھا کہ بسا اوقات اُنہیں یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اُنہیں کتنی ادائیگی ہونی چاہیے اور یہ کہ ان

سے جس رقم کا وعدہ کیا گیا تھا وہ اُنہیں مل رہی ہے یا نہیں۔ ایسا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تمام ادائیگیاں منظم خود کرتے ہیں اور مزدوروں سے انگوٹھوں کے نشان حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی بھی مزدوروں کو اُن کے معاہدات کی تفصیل سے آگاہ نہیں کرتے۔

کام کے حالات کار

اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے حالات کار میں مثبت تبدیلی کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے آدم مسیح کا کہنا تھا کہ ''ریاست کو ہمارے قرضوں کی ادائیگی میں ہماری مدد کرنی چاہیے۔'' اُن کی یہ بھی رائے تھی کہ حکومت کو انہیں چھوٹے کاروبار شروع کرنے کے لیے رقم دینی چاہیے۔ ایچ آر سی پی کی سینئر مینیجر طاہرہ حبیب کا کہنا تھا کہ ''قانون کی حکمرانی پر عملدرآمد میں رخنوں کو بند کرنے کے لیے بحث کو شروع کرنا ضروری ہے۔''

قیصر نامی ایک مزدور نے کہا ''ہمیں مقتدر لوگوں سے کوئی امید نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ہمارے حالات کار کا جائزہ نہیں لے گا۔ کوئی قانون سازی نہیں ہوگی اور منتخب نمائندے ہماری حالتِ زار اور ہماری ضروریات کو یوں ہی نظر انداز کرتے رہیں گے۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں گی لیکن مزدوروں کی بدحالی جوں کی توں رہے گی۔ مقتدر لوگوں کو ہماری پروا نہیں۔ وہ اپنی ہی بہبود اور اپنے ہی مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔'' گلگت بلتستان میں چیری چننے والے شوکت نے کہا ''ہاں، ہم جب چاہیں نوکری چھوڑ سکتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ ہمارے لیے کوئی نئی نوکری تلاش کرنا بہت دشوار ہوگا۔''

کام کی جگہ پر محفوظ ماحول کا فقدان

کام کی جگہ پر محفوظ ماحول کا نہ ہونا بھی مزدوروں کے لیے ماحول کو لاحاصل بنانے میں ایک کلیدی جزو ہوتا ہے۔ اکثر مزدوروں نے اس بات کی تصدیق کی کہ جہاں وہ کام کرتے ہیں وہاں کسی قسم کے حفاظتی اقدامات نہیں کیے گئے۔ گلگت بلتستان میں چیری چننے والے رضانے بتایا ''گلگت بلتستان میں نجی اداروں میں حفاظتی اقدامات کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ملازمین کو ایسے اقدامات کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں''۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں کام کے دوران کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔''

10 اپریل 2019 کو درہ آدم خیل میں ایک کان میں دھماکے میں 4 کان کن ہلاک ہو گئے تھے۔ کانوں میں کچھ دھماکے کان کنوں کے نادانستہ فعل سے بھی ہوئے۔ زیرِ زمین کھدائی سے نکلنے والی میتھین گیس ہوا کے ساتھ مل کر ایک بہت دھماکہ خیز آمیزہ بنا دیتی ہے۔ ایسے ہی ایک دھماکے کے نتیجے میں ایک کارکن جو کھدائی کرنے والوں میں شامل تھا شدید زخمی ہوا اور ڈیڑھ ماہ تک ہسپتال رہا ایک اور مزدور سال بھر سے بستر پر ہے۔ ایسے حادثوں کا شکار ہونے والوں کو ہسپتال لے جانے کے لیے کچھ کانوں کی اپنی ایمبولینسیں ہیں لیکن اکثر کانوں میں ایسی سہولتوں کا فقدان ہے۔ اس موقع پر ریسکیو 1122 کی اور سرکاری ایمبولینسوں کو فی الفور جائے حادثہ پر آنا پڑا تھا۔ حال ہی میں ڈیگاری میں کوئلہ کی کان کے ایک حادثے میں 10 کارکن ہلاک ہوئے اور ایک زخمی ہوا۔ تاہم یہ سب لوگ افغان تھے۔ اس لیے ان کی موت کے سرٹیفکیٹ جاری نہیں ہوئے۔ اس کی بجائے لاشیں برآمد ہونے پر اُنہیں فوراً افغانستان بھجوا دیا گیا۔ کوئلے کے کان کن رحمان نے اس حادثے کا احوال سنایا۔ ''جس کان میں یہ حادثہ ہوا وہ حکومت کی ملکیت ہے جس نے اسے ایک نجی کمپنی کو ٹھیکے پر دے رکھا ہے۔ اس کے باوجود حکومت اس کان میں کام کی نگرانی نہیں کر رہی ہے کیونکہ ٹھیکے کے معاہدے میں صرف حکومت کو واجب الادا رقم کی تفصیل ہے۔ یہ حادثہ بجلی کی بوسیدہ تاروں کی وجہ سے پیش آیا جن کی آخری دفعہ 1959 میں مرمت ہوئی تھی اور اس لیے کہ کسی ناگہانی آفت کی صورت میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کان گیس سے بھر گئی تھی جس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔''

آخری بات یہ ہے کہ مالکان یونین بننے ہی نہیں دیتے جس کی وجہ سے مزدوروں کے مسائل پر کبھی کام نہیں ہو پاتا۔

سفارشات

1- جنوری 2016 میں پنجاب میں جاری ہونے والے آرڈیننس کو جس کے تحت پیشگی کے نظام کو بحال کر کے اس کی حد 50,000 روپے مقرر کی گئی ہے واپس لیا جائے۔

2- حالات کار میں بہتری لانے، کم از کم اجرتوں سمیت محنت کشوں سے متعلق تمام قوانین پر عملدرآمد، کام کے لیے محفوظ ماحول کی یقین دہانی اور کام کی جگہوں پر جبری مزدوری اور بچوں سے کام لینے جیسے رواجوں کا پتہ چلانے کے لیے محکمہ محنت کی طرف سے معائنے کو باقاعدہ بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے لیبر انسپکٹرز کی مطلوبہ تعداد کی بھرتی کا عمل مزید تاخیر کے بغیر شروع کیا جائے۔

3- محنت سے متعلق قوانین پر مؤثر عملدرآمد کے لیے ضلعی نگران کمیٹیوں کو فعال بنایا جانا چاہیے نیز اُن کے کام کی نگرانی کے لیے بھی کسی قسم کا جواب دہی کا نظام ہونا چاہیے۔

4- ملک بھر میں کام کی جگہوں پر قومی شناختی کارڈ بنانے کے لیے ایک مہم شروع کی جانی چاہیے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ وہاں کام کرنے والے تمام لوگوں کا ملازمین کی حیثیت سے اندراج ہو جائے۔ سماجی تحفظ کے کارڈ کے اجراء کو بھی اسی طرح یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

5- کم از کم اجرتوں کی ادائیگی کے قانون پر من وعن عملدرآمد ہونا چاہیے۔

6- جن مزدوروں اور کروں کے پاس فی الوقت کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈ نہیں ہیں اُن کے اندراج کے لیے کوئی طریق کار وضع کیا جانا چاہیے اور جب تک ان کے کارڈ نہیں بنتے اس پر عمل درآمد ہونا چاہیے۔

7- جبری مزدوری کے قانون میں مناسب ترمیم کے ذریعے مزدور بچوں کے اوقات کار کو محدود کرنے کو یقینی بنانا چاہیے تاکہ اُنہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مناسب وقت دیا جا سکے۔

8- صحت اور سلامتی کے حالات سے متعلق کم از کم معیار کو یقینی بنانا چاہیے۔

9- پولیس کو مزدوروں کی طرف سے دائر کی گئی شکایات کو وصول کرنے کے لیے جواب دہ بنایا جانا چاہیے۔

10- زرعی بینکوں کی طرف سے مہیا کیے جانے والے قرضوں کی سہولت مزارعوں کو بھی ملنی چاہیے۔ فی الوقت یہ سہولت صرف زمین کے مالکان کو میسر ہے۔

11- گروی مزدوروں کے بچوں کے لیے تعلیم کے خصوصی انتظامات ہونے چاہئیں۔

12- کان کنی میں صحت اور سلامتی کے 1995 کے معاہدے کی توثیق کے علاوہ حکومت پاکستان کو زیر زمین کانوں کے لیے تجویز کیے گئے 2006 کے ضابطے پر بھی عمل کرنا چاہیے۔ کانوں میں ہونے والے حادثات کی جامع تفتیش ہونی چاہیے اور کانوں کے مالکان کی غفلت ثابت ہونے کی صورت میں انہیں بھاری جرمانوں کی سزا ملنی چاہیے اور ان کے لائسنس منسوخ ہو جانے چاہئیں۔ مزید برآں تپ دق اور جلدی بیماریوں سے بچاؤ کے لیے مزدوروں کے باقاعدہ معائنے کے لیے صحت کی سہولتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔

1۔ آئی۔اے۔رحمان: بچوں کی مشقت کا ناقص قانون۔

2۔ ڈان۔2016/8/9

https://epaper.dawn.com/DetailImage.phpStoryImage=08_09_2016_008_002

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جا سکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جا سکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط وکتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آ جانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جا سکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ - 21 (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب ومعقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جا سکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے، جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہو سکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جا سکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

Human Rights Commission of Pakistan
جہد حق
Monthly JEHD-E-HAQ

13 دسمبر 2019، اسلام آباد: مذہبی اقلیتوں کے لیے ایڈووکیسی اور قانونی امداد قومی بین المذاہب ورکنگ گروپ کا اجلاس

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107۔ ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35838341-35864994 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15